عنایت اللہ

پتن پتن کے پاپی

سات سچی آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں کا مجموعہ



مکتبہ داستان

پتن پتن کے پاپی

عنایت اللہ







واحد تقسیم کار

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 7232336'7352332 فیکس: 7223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

فہرست

سمگلر، طوائف اور مولوی

اس ڈرامے کا آخری کردار بھی اس دُنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ اب میں یہ کہانی سنا سکتا ہوں۔ راولپنڈی شہر سے کچہری کے راستے چک لالہ کی طرف جاؤ تو راستے میں لئی کا پُل آتا ہے جو بہت اُونچا ہے۔ اب تو یہ علاقہ گنجان آباد ہو گیا ہے۔ پاکستان بننے سے تھوڑا عرصہ بعد تک یہ علاقہ اتنا ویران تھا کہ رات کے وقت پُل کے قریب رہزنی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ پُل کے نیچے نالہ لئی کے کنارے رہزنوں کے کسی شکار کی لاش اکثر پڑی ملتی تھی۔ شام کے بعد لوگ کم ہی اس طرف سے گذرتے تھے۔

۱۹۵۰ء کے شروع میں پُل کے نیچے ایک اور لاش پڑی دیکھی گئی۔ اتفاق سے میرا گذر ادھر سے ہوا تو میں نے لاش دیکھ لی۔ کھوپڑی اس طرح کھلی ہوئی تھی جیسے کسی نے اوپر سے وزنی پتھر یا بڑا ہتھوڑا مارا ہو۔ گردن جسم میں دھنس گئی تھی۔ یہ بدقسمت انسان رہزنوں کا شکار معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اُس کے جسم پر ایک میلی کچیلی دھوتی کے سوا اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ داڑھی لمبی تھی اور وہ پاگل تھا۔ پولیس نے لاش کو لاوارث قرار دے کر کہیں دفن کر دیا اور ایک دردناک کہانی مٹی میں دب گئی۔

وہ لاش واقعی لاوارث تھی اور مرنے والا پاگل تھا جسے صرف تین

انسان جانتے تھے ـــــ ایک سمگلر، ایک طوائف اور میں ـــــ سمگلر کو مرے چھ سال گذر گئے ہیں اور چند مہینے گذرے طوائف بھی مرگئی ہے ۔ یہ اس ڈرامے کا آخری کردار تھا جس کے مرنے کے بعد میں ساری کہانی سنا سکتا ہوں ۔ سنانے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مرنے سے بہت عرصہ پہلے سمگلر، سمگلر نہیں رہا اور طوائف، طوائف نہیں رہی تھی ۔ وہ راولپنڈی کے ایک گوشے میں شریفانہ زندگی بسر کر رہے تھے ۔ میری حیثیت اُن کے دوست کی تھی ۔ یہ دوستی اتفاقیہ شروع ہوئی تھی اور ایسے حالات میں ہوئی تھی جنہیں انسان ایک ہزار سال زندہ رہے تو بھی بُھلا نہیں سکتا ۔

میں اگست ۱۹۴۷ء کے آخری دنوں کو کیسے بُھلا سکتا ہوں جب میں کشمیر سے اس حالت میں پاکستان کی طرف آ رہا تھا کہ میری ران میں ایک ڈوگرے کی سنگین کا گہرا زخم تھا ۔ ایک بازو اور کندھا بالکل سُن اور بے جان ہو گئے تھے کیونکہ کندھے پر دوسرے ڈوگرے نے رائفل کا بٹ مارا تھا ۔ ران کے زخم پر میں نے ایک گندا کپڑا، جو مجھے راستے میں پڑا ملا تھا باندھ رکھا تھا ۔ خون بہتا جا رہا تھا اور میں خون کا آخری قطرہ بہہ جانے سے پہلے پاکستان میں داخل ہونے کے لیے تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اگر میرا صرف جسم زخمی ہوتا تو شاید اپنے آپ کو سنبھالے رکھتا ۔ میری رُوح اور میرا دل بہت زیادہ زخمی تھے ۔ یہ زخم ایسے تھے جو مجھے چلنے نہیں دیتے تھے ۔

میں اپنے سارے کنبے میں اکیلا زندہ بچا تھا اور توقع یہی تھی کہ میں بھی جو اپنے کنبے کا آخری فرد ہوں، پاکستان کی سرحد سے دُور کسی پتھریلی وادی میں گر کر مر جاؤں گا اور میری لاش بھیڑیئے کھائیں گے ۔

میری موت اور میرے کنبے کی موت میں فرق یہ تھا کہ میری ماں، میرا باپ، دو بھائی، دو بہنیں، ایک بھائی کی بیوی اور اُس کا دُودھ پیتا

بچّہ اور میرا دادا جلتے ہوئے مکان میں زندہ جل گئے تھے میں پاکستان کے راستے میں مرنے کے لیے زندہ بچ گیا تھا ۔ ڈوگرے فوجیوں اور شہر کے ہندوؤں نے رات کو اُس وقت ہمارے مکان کو آگ لگائی تھی جب ہم سب گہری نیند سوئے ہوئے تھے ۔ یہی ہماری غلطی تھی کہ ہم سو گئے تھے ۔ وہ سونے کے دن نہیں تھے ۔

ریاست کی فوج، ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام، آتش زنی اور لُوٹ مار شروع کر دی تھی ۔ مسلمانوں نے کئی جگہوں پر باقاعدہ مقابلہ شروع کر دیا تھا اور باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی تھی ۔ ہم ایسے علاقے میں تھے جہاں ابھی مجاہدین نہیں پہنچے تھے ۔ ڈوگرے، مجاہدین سے شکست کھا کر بھاگتے تھے تو غیر مسلم شہریوں کو ساتھ ملا کر شکست کا بدلہ ہم سے لیتے تھے ۔

ہمارے سامنے یہی ایک راستہ تھا کہ پاکستان چلے جائیں ۔ کچھ کنبے چلے گئے تھے ۔ بہت سے رہ گئے تھے ۔ رات کو کوئی مسلمان سوتا نہیں تھا لیکن ہم سو گئے تھے ۔ شعلوں کی تپش نے ہمیں جگایا ۔ ہم میں سے جو کوئی باہر کو بھاگا اُسے باہر کھڑے کافروں نے اٹھا کر آگ میں پھینک دیا ۔ میرا ایک بھائی زندہ تھا ۔ ہم نے مقابلہ کیا جس میں میرا بھائی مارا گیا اور مجھے بھاگنے کا راستہ مل گیا ۔ پیچھے سے ایک ڈوگرے نے میری ران میں سنگین اتار دی اور دوسرے نے کندھے پر بٹ مارا ۔ میں گر پڑا ۔ پھر اُن کی توجہ شاید کسی اور طرف ہو گئی ورنہ وہ مجھے بھی اٹھا کر آگ میں پھینک دیتے ۔

میں زخمی جسم کو گھسیٹتا اور جلتے ہوئے مکانوں کے شعلوں سے بچتا بستی سے نکل آیا ۔ وہ تو قیامت کا سماں تھا جہاں بے گناہ مسلمان اور اُن کے معصوم بچے جل رہے تھے ۔ معلوم نہیں کتنی مسلمان لڑکیاں کافروں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں ۔

وہ لوگ جو اس قیامت اور ایسے حالات سے نہیں گذرے وہ
میری اُس وقت کی جسمانی اور روحانی حالت کا اندازہ نہیں کرسکتے جب
میں اتنا شدید زخمی ہو کر پتھریلی اور اندھیری وادیوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا
اور میرے کنبے کے دُودھ پیتے بچے سے لے کر دادا تک جل رہے تھے۔
یہ تو زندگی سے جھوٹا پیار تھا جو مجھے مرنے سے ڈرا رہا تھا، ورنہ مجھے بھی اپنے
کنبے کے ساتھ جل جانا چاہیئے تھا۔

جب صبح طلوع ہوئی تو میں قدم گھسیٹتا چلا جا رہا تھا جسم کی طاقت
ختم ہو گئی تھی۔ خون بھی ختم ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے پیچھے مجھے کسی کی کھانسی
اور قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھے بغیر انہیں ڈوگرے سمجھا
اور بھاگنے لگا مگر ایسا گرا کہ کوشش کے باوجود اُٹھ نہ سکا۔

دو آدمی میرے پاس رُکے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ خوف اور غم
سے میں رونے لگا۔ انہوں نے مجھے تسلی دلاسہ دیا۔ تب پتہ چلا کہ وہ دونو
مسلمان ہیں اور میری طرح پاکستان کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے
انہیں اپنے کنبے کے متعلق بتایا اور میں بہت ہی رویا۔ انہوں نے مجھے
اُٹھا لیا اور ایک محفوظ اور ٹھنڈی جگہ لٹا دیا۔ پھر وہ مجھے پاکستان تک کس
طرح لائے، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں آپ کو صرف اُس آدمی کی کہانی
سنانا چاہتا ہوں جس کی لاش ۱۹۵۰ء میں نالہ لئی کے کنارے پڑی تھی۔

یہ دو آدمی جو میرے لیے آسمان سے اترے ہوئے فرشتوں سے کم
نہیں تھے، میری طرح پناہ گزین تھے لیکن وہ میری طرح خوف زدہ نہیں
تھے۔ انہوں نے راستے میں جانے کہاں سے ایک خچر لے لی تھی جس پر
ڈال کر وہ مجھے پاکستان لائے تھے۔ راستے میں وہ اس طرح ہنس ہنس کر
باتیں کر رہے تھے جیسے ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ اور ریاست میں
ڈوگروں کے ظلم اور مجاہدین کے جہاد کے ساتھ انہیں کوئی دلچسپی نہیں

اور انہیں ڈوگروں سے کوئی خوف یا خطرہ نہیں بلکہ میں نے یہ بھی محسوس
کیا کہ وہ خوش ہیں کہ ریاست کے اندر اور سرحدوں پر خون خرابہ شروع
ہو گیا ہے۔ میرے لیے ان کی باتیں حیران کن تھیں اور اس سے زیادہ حیرت
والی بات یہ تھی کہ میرے ساتھ ان کا رویہ اتنا مشفقانہ تھا جیسے میں ان کے
پاس کسی بزرگ کی امانت ہوں۔ بہرحال وہ میرے لیے پُراسرار انسان
بن گئے۔

وہ مجھے ایک گاؤں میں لے گئے جس کے متعلق انہوں نے بتایا کہ یہ
پاکستان کا گاؤں ہے۔ مجھے ایک گھر میں چھوڑ کر خود کہیں چلے گئے۔ اس
گھر میں دو عورتیں تھیں اور دو مرد۔ بچہ کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے گاؤں
کے کسی سیانے کو بلا کر میری مرہم پٹی شروع کر دی اور میری تیمارداری اور
خاطر و مدارات بڑے پیار سے مگر پُراسرار طریقے سے کی۔ وہ مجھ سے میرے
متعلق باتیں پوچھ لیتے تھے، اپنے متعلق کچھ نہیں بتاتے تھے۔

دونو عورتیں دیہاتی تھیں لیکن غیر معمولی طور پر خوبصورت۔ دونو مرد
کسان لگتے تھے لیکن بات چیت اور کام کاج میں بڑے ذہین اور چُست۔
وہ صرف لباس سے دیہاتی لگتے تھے۔ رات کے وقت جب میں الگ
کمرے میں لیٹا ہوتا تھا، دوسرے کمرے اور صحن میں ایسی سرگرمی ہوتی
تھی جیسے اچانک مہمان آ گئے ہوں اور گھر کے افراد میزبانی کے فرائض
کے لیے بھاگ دوڑ رہے ہوں۔

شروع شروع میں میں نے دو چار بار اُن سے پوچھا کہ رات کو مہمان
کہاں سے آتے تھے؟ مجھے ہر بار گول مول سا جواب ملا۔ ایک بار ایک
عورت نے جھنجھلا کر جواب دیا ——— "ویر جی! یہاں تو کوئی نہ کوئی
آتا ہی رہتا ہے۔ آپ چُپ کر کے سو جایا کریں"۔
جو دو آدمی مجھے یہاں چھوڑ گئے تھے وہ پندرہ سولہ روز بعد واپس آئے۔

مجھ سے حال احوال پوچھا اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ تمہارا زخم اور چوٹ ٹھیک ہو جائے تو تمہیں کسی شہر چھوڑ آئیں گے۔

مجھے جب اپنے وہ عزیز یاد آتے تھے جو زندہ جل گئے تھے تو میری حالت پاگلوں کی سی ہو جاتی تھی۔ میں اتنا روتا تھا کہ ہچکیاں تھمتی نہیں تھیں۔ جب اپنے مستقبل کے متعلق سوچتا تھا تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ دم گھٹنے لگتا تھا۔ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا پاس پلے کچھ بھی نہیں تھا۔

شاید ڈیڑھ مہینہ گزرا ہوگا کہ میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ ایک روز وہ دونو آدمی آ گئے تو میں نے انہیں کہا کہ اب مجھے کسی ٹھکانے پہ پہنچا دیں اور مجھے بتائیں کہ اب میں کیا کروں۔ ان میں سے ایک نے مجھے سر سے پاؤں تک گہری نظروں سے دیکھا پھر میرے چہرے پہ نظریں جما کر بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ آخر دھیمی سی آواز میں پوچھا۔ "ہمارے ساتھ کام کرو گے؟"

"کیوں نہیں کروں گا"۔ میں نے جواب دیا۔ "نہیں کروں گا تو زندہ کیسے رہوں گا؟ کام بتائیے کیا ہے"؟

جب اُس نے کام بتایا تو میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ——

"نہیں۔ یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا"۔

وہ سمگلر تھے اور مجھے اپنے گروہ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ کشمیر کی اُس وقت کی صورت حال میں ان کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ لوٹ مار عام تھی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ لوگ کشمیر کے اندر جا کر مسلمان گھروں کو بھی لوٹتے تھے یا نہیں۔ انہیں میرے متعلق یہ تو معلوم ہی تھا کہ میرا اب دنیا میں کوئی نہیں رہا اور اب میں زندگی کا نیا راستہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ ان دو آدمیوں نے مجھے اپنے پیشے کے متعلق سبز باغ دکھانے شروع کر دیئے۔ وہ چونکہ میرے محسن تھے اس لئے ان کی ہر بات میرے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ وہ مجھے زخمی حالت میں اُٹھا نہ لاتے اور یہاں میرا علاج نہ ہوتا تو میں کبھی کا مر

چکا ہوتا۔ اس کے باوجود میں رضامند نہ ہوا۔

انہوں نے کہا کہ تھوڑا عرصہ اور یہیں گذارو۔ اگر طبیعت مان جائے تو بتا دینا۔ ہم تمہیں راستہ دکھا دیں گے۔ کئی ڈھنگ سکھا دیں گے اور جتنی خوب صورت لڑکی چاہو گے لا کر تمہارے ساتھ بیاہ دیں گے۔

مجھ میں انہیں دو خوبیاں نظر آتی تھیں۔ ایک یہ کہ میں جوان تھا اور دوسرے یہ کہ میں تعلیم یافتہ تھا۔ میری سب سے بڑی یہ خوبی انہیں پسند آئی تھی کہ میرے لیے کوئی پناہ نہیں تھی اور میں اس ملک میں اجنبی تھا۔ میں نے اُن کی یہ بات مان لی کہ تھوڑا عرصہ رُک جاتا ہوں، چنانچہ میں وہاں رُک گیا۔

اس روز کے بعد گھر میں جو دو عورتیں تھیں وہ مجھ میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگیں۔ اس سے پہلے میرے ساتھ اُن کا تعلق اتنا ہی تھا کہ مجھ سے میری صحت کے متعلق پوچھ لیتی تھیں اور کھانا دینے کے لیے میرے کمرے میں آتی تھیں۔ اب بڑی بے تکلفی سے باری باری میرے پاس بیٹھنے لگیں اور ہنسی مذاق بھی شروع کر دیا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ غیر معمولی طور پر خوب صورت تھیں۔ میں یہ تو سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے اپنے جال میں پھنسا رہے ہیں لیکن مجھے کوئی اور طریقہ نہیں سوجھتا تھا جس سے میں اس جال سے بچا رہتا۔ میں کوئی فرشتہ تو نہیں تھا۔ اُن کا انداز ایسا تھا جسے میں دوستانہ بے تکلفی کہہ سکتا ہوں، بے حیائی نہیں۔ یہی ان کی چال تھی کہ میں ان کا گرویدہ ہو کر انہیں پا لینے کے لیے آگے بڑھوں اور وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے مجھے اپنے جال یا پھندے تک لے جائیں۔

میرے گھر کا ماحول شریفانہ تھا جس پر مذہب غالب تھا۔ میں اب اتنا زیادہ دکھی تھا کہ غم سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے ان دو عورتوں کی بے تکلفی اچھی لگتی تھی۔ دل بہل جاتا تھا مگر تربیت کا اثر اپنے اندر سے

اُبھرتا تھا تو میں بہت ڈرتا تھا کہ گناہ نہ کر بیٹھوں ۔ ذرا میری ذہنی حالت کو تصور میں لانے کی کوشش کیجئے کہ غم مجھے اس طرح کھا رہا تھا جیسے کسی گناہگار کی لاش کو کیڑے کھاتے ہیں ۔ اس اذیت سے بھاگ کر میں ان خوب صورت عورتوں کے ہنسی مذاق میں پناہ ڈھونڈتا تھا ۔ جب گناہ کا خیال آتا تھا تو میں خدا کی پناہ ڈھونڈنے لگتا تھا ۔ نیکی اور گناہ کی کش مکش مجھے بے حال کر رہی تھی ۔ یہ کش مکش بجائے خود ایسی اذیت بن گئی کہ میں خدا کے حضور گڑگڑانے لگا ۔

گاؤں میں مجھے اذان کی آواز سنائی دیا کرتی تھی جو تھوڑے دنوں سے بند ہو گئی تھی ۔ وجہ یہ تھی کہ کشمیر کی جنگ زور پکڑ گئی تھی ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سرحد سے پٹھان بھی آ کر کشمیر کے جہاد میں شریک ہو گئے ہیں ۔ ہندوستان نے اپنے ہوائی جہاز بھی استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے ۔ یہ گاؤں سرحد پر تھا ۔ ہندوستانی ہوائی جہاز دو دفعہ اس گاؤں پر بھی گولیاں برسا گئے تھے ۔ کوئی انسان تو نہ مرا، بہت سے مویشی مارے گئے تھے ۔ گاؤں کے لوگ گاؤں خالی کر گئے تھے ۔ جس گھر میں میں رہ رہا تھا وہ ابھی آباد تھا ۔

ایک صبح میری آنکھ بہت سویرے کھل گئی ۔ میرے کان میں اذان کی آواز پڑی ۔ میں حیران ہوا کہ اس اُجڑے ہوئے گاؤں میں مؤذن کسے پکار رہا ہے ؟ آواز میں پرسوز ترنّم تھا ۔ میں اُٹھا اور گاؤں کی ویران گلیوں میں سے ہوتا ہوا مسجد میں چلا گیا ۔ صبح کی خاموشی میں دُور سے توپوں کے دبے دبے دھماکے سُنائی دے رہے تھے ۔ مسجد کے صحن میں ایک آدمی ٹہل رہا تھا ۔

میں نے وضو کیا اور اُس کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ وہ بھرے بھرے چہرے والا جوان سا مولوی تھا ۔ اسی نے اذان دی تھی ۔ میں نے

اسے بتایا کہ اس گاؤں میں ہمارے گھر کے سوا کوئی گھر آباد نہیں اور میرے گھر میں کوئی ایک بھی نمازی نہیں ۔

” مجھے کسی نمازی اور مقتدی کی ضرورت نہیں “ ۔ اس نے جواب دیا ۔ ” میں ایسے ہی گاؤں کی تلاش میں تھا جہاں مسجد اور میرے سوا اور کوئی نہ ہو “ ۔

اس کے بعد اُس سے ہر روز ملاقات ہوتی رہی بلکہ دن میں کئی کئی بار ملاقات ہوتی رہی ۔ اب میری حالت یہ ہو گئی تھی کہ گھر میں میں ان دو عورتوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا تھا یا مسجد میں مولوی کے پاس بیٹھا زہد و تقویٰ کی باتیں سنتا تھا ۔ مجھ پر دونوں کا اثر ایک جیسا تھا ۔

مولوی سے بات بے تکلفی پیدا ہو گئی تو اُس نے بتایا کہ اُس کا باپ مقبوضہ کشمیر کے ایک گاؤں کی مسجد میں امام تھا ۔ اُس کے گاؤں کا مولوی ابھی بچہ ہی تھا کہ اُس کی ماں مر گئی ۔ اس کا اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا ۔ باپ نے اسے پالا پوسا ۔ خود ہی اسے گھر میں پڑھایا اور تعلیم کو مذہب تک محدود رکھا ۔ جب لڑکے کا شعور جاگا تو اس نے دیکھا کہ باپ لوگوں کو تعویذ دیتا اور ٹونے ٹوٹکے بتاتا ہے ۔ اس نے ایک کتاب رکھی ہوئی تھی جس کے متعلق اُس نے لڑکے کو بتایا تھا کہ اس میں ایسے طریقے درج ہیں جن سے لوہا سونا بن جاتا ہے ——— ” لیکن ...... “ باپ نے اسے بتایا تھا ——— ” اس کے لیے چھ چھ مہینے کے چلّے کاٹنے پڑتے ہیں “ ۔

باپ نے اُسے یہی تعلیم دی تھی کہ یہ دنیا جہنّم ہے ۔ جو کوئی دُنیا سے دل لگا لیتا ہے وہ اگلے جہان جہنّم میں جاتا ہے ۔ لڑکے کے باپ نے اسے عورت سے اس طرح ڈرا رکھا تھا جیسے عورت کے سائے سے بھی مرد ناپاک ہو جاتا ہو ۔ لڑکے نے گھر میں نہ ماں دیکھی تھی نہ بہن ۔ وہ باپ کی گود میں کھیلا اور اسی کے ہاتھوں بڑا ہوا ۔ اس لیے اُس کے خیالات پر باپ کا اثر تھا اور باپ کی ہر بات کو وہ آسمان سے اُترا ہوا فرمان سمجھا کرتا تھا ۔

اس مولوی نے مجھے بتایا کہ وہ مذہب میں ڈوب گیا اور مسجد کو ہی اپنا گھر بنالیا۔ اس کا ہر قول اور ہر فعل مذہب کا پابند تھا۔ اُس نے لڑکپن میں ہی چلّے کاٹنے شروع کر دیئے تھے۔ گھر میں اُس کے باپ سے کوئی عورت تعویذ لینے آجائے تو وہ قریب نہیں بیٹھتا تھا کیونکہ باپ نے اُسے عورت سے ڈرا رکھا تھا، اسی لیے جب ۴۸ - ۱۹۴۷ء میں اس کی عُمر اٹھائیس تیس برس ہو چلی تھی، اس نے شادی نہیں کی تھی۔ باپ نے اسے ایک خاص وظیفہ بتایا تھا جس کی قبولیت کی شرط یہ تھی کہ دُنیا کے ہنگاموں سے دُور کسی ویران جگہ کیا جائے۔ وظیفے کے لیے رات کا وقت مقرر تھا اور قبول ہو جانے کی صورت میں اس کا کرشمہ یہ بتایا گیا تھا کہ جنوں کا بادشاہ بھی قبضے میں آجاتا ہے اور انسان، انسانوں اور جنوں کا امام بن جاتا ہے۔

اب کشمیر میں ڈوگروں نے مسلمانوں کو قتل کرنا اور اُن کے مکانوں کو جلانا شروع کر دیا تو اس کا باپ مسجد میں شہید کر دیا گیا اور بیٹا جان بچا کر نکل آیا۔ وہ باپ کے ٹونوں ٹوٹکوں والی کتاب اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ بہت کوشش کے بعد اِسے یہ گاؤں مِلا تھا جو وظیفے کی شرائط کے مطابق ویران تھا اور مسجد بھی تھی۔

میں جب اُس کے پاس جا بیٹھتا تھا تو مجھے وہ خداوند تعالیٰ، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن پاک اور حدیث شریف کی ایسی باتیں سنایا کرتا تھا کہ میرے دل سے غم کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ میں نے اسے سنایا کہ کس طرح میرا کنبہ جل گیا ہے تو اُس نے قرآن اور حدیث کے حوالے دے کر مجھے ایک خوش باش انسان بنا دیا۔ اُس نے کہا کہ دنیاوی رنج و آلام اور مسرتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ جو کوئی ان کا اثر قبول کرتا ہے وہ اگلے جہان دوزخ کی آگ میں جلتا ہے۔

مولوی مجھے مذہب کے رنگ میں رنگتا چلا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی گھر میں دو عورتیں مجھے اپنے رنگ میں رنگنے کی نہایت حسین اور دلفریب کوششیں کر رہی تھیں۔ یہ میری کمزوری تھی کہ جو لذت مجھے مسجد میں ملتی تھی ویسی ہی ان عورتوں سے حاصل ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا دل زخمی تھا اور رُوح بھی مجروح تھی۔ میں دراصل سکون کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اس دوران وہ دو آدمی دو مرتبہ آئے اور خلوص اور پیار سے مجھے اپنے گروہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔

میں نے آخر رضامندی کا اظہار کر دیا اور جو دو آدمی اس گھر میں رہتے تھے وہ مجھے زبانی ٹریننگ دینے لگے۔ مَیں یہ ٹریننگ لیتا رہا اور مسجد میں مولوی کے پاس بھی بیٹھتا رہا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھتا رہا۔

ایک مہینے بعد ایک رات مجھے جگایا گیا۔ ایک سوٹ کیس دے کر مجھے راستہ سمجھایا گیا اور بتایا گیا کہ فلاں جگہ جا کر رُک جانا۔ ایک آدمی آئے گا اور تم سے پُوچھے گا ——— "بھائی پنڈتاں والی کھڈ کو کون سا راستہ جاتا ہے"؟ ——— تم کہنا ——— "بُٹیے کی طرف سے جاؤ گے یا جوگیال کی طرف سے"؟ ——— وہ جواب دے گا ——— "بُٹیے کی طرف سے" ——— تم اُسے یہ سوٹ کیس دے دینا اور وہ تمہیں جو کچھ دے وہ لے آنا۔

یہ پہلا جرم تھا جو مَیں نے کامیابی سے مکمل کیا اور اُس آدمی نے مجھے ایک گٹھڑی دی جو مَیں لے آیا۔ رات ابھی بہت باقی تھی۔ مَیں تھک گیا تھا۔ سر نیند سے بوجھل تھا لیکن لیٹا تو نیند نہ آئی۔ دل پر ایسا بوجھ تھا جس نے باقی رات بے چین رکھا۔ یہ جُرم کا بوجھ تھا۔

پندرہ روز بعد مجھے ایسے ہی ایک اور جُرم کے لیے بھیجا گیا۔ وہ بھی مَیں نے کامیابی سے کر لیا لیکن اس دفعہ دل اور دماغ کی حالت پہلے سے بھی زیادہ بُری ہو گئی۔ جسم کے اندر کانٹے چبھتے تھے اور دل چاہتا تھا کہ کسی کو بتا دوں کہ میں ایک جُرم کر رہا ہوں۔ شاید اس سے کچھ سکون مل جائے۔

تیسری بار بھی میں جرم کر آیا اور صبح اُٹھتے ہی مسجد میں جا کر مولوی کو بتا دیا کہ میں کس راہ پر چل پڑا ہوں۔ میں نے گناہ کا اعتراف کیا تو مولوی نے مجھ سے توبہ کروائی اور کچھ پڑھ کر میرے سارے جسم پر پھونک ماری۔ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ میرے گناہ بخشے گئے ہیں اور مجھے مشورہ دیا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔

"گناہ کی دولت سے بہتر ہے کہ نیکی کر کے بھوکے مر جاؤ۔" اُس نے کہا۔ "جو کچھ ہے اگلا جہان ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔"

ایک رات جب گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ میں چپکے سے اُٹھا۔ ان لوگوں نے مجھے تین جرائم کا تین سو روپیہ معاوضہ دیا تھا۔ ساری رقم میرے پاس محفوظ تھی۔ میں گھر سے نکلا، پھر گاؤں سے نکلا اور کھیتوں میں چلتے چلتے دُور نکل گیا۔ صبح تک میں ایک شہر میں پہنچ گیا۔ ایک آدمی سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اس شہر کا نام گجرات ہے۔ میرے پاس پیسے کافی تھے۔ تھوڑے دن وہاں کام تلاش کیا۔ راتیں مختلف مسجدوں میں گذاریں لیکن کہیں بھی نوکری نہ ملی۔ کسی نے راولپنڈی جا کر قسمت آزمائی کا مشورہ دیا اور میں راولپنڈی چلا گیا۔ میں نے اتنا بڑا شہر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اپنے آپ سے کہا کہ یہاں بھی نوکری نہ ملی تو کہیں بھی نہیں ملے گی۔ میں نے ایک محلّے میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور نوکری کی تلاش کرنے لگا۔

مسجد میں جا کر نماز پڑھتا اور خدا سے رو رو کر التجائیں کرتا کہ میں گناہوں کی لذّت سے بھاگ کر آیا ہوں اور میرے سارے ہی عزیز اس لیے زندہ جلا دیئے گئے ہیں کہ وہ تیرے اور تیرے رسولؐ کے نام لیوا تھے۔ اللہ نے دعائیں قبول کر لیں اور مجھے ایک نوکری مل گئی۔ اکیلی جان تھی، ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تھوڑا نہیں تھا۔

چھ سات مہینے اسی جگہ نوکری کی۔ دفتری کام کا تجربہ ہو گیا۔ میٹرک تک تعلیم بھی تھی۔ مجھے اس سے بہتر ایک اور جگہ نظر آئی تو وہاں درخواست

دے دی۔ خدا کی ذات نے کامیابی عطا فرمائی اور میں دو سو روپے ماہوار پر لگ گیا۔

۱۹۴۹ء میں کشمیر کے ایک مہاجر خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی اور مل ملا کر ایک مکان بھی الاٹ کرا لیا۔ سال کے آخر تک میری آمدنی میں خاصا اضافہ ہو گیا کیونکہ یہ پرائیویٹ کاروباری فرم تھی جس نے میری دیانت داری اور اہلیت سے متاثر ہو کر میری تنخواہ اور حیثیت بلند کر دی تھی۔ اس کاروبار اور ٹھیکیداری کے سلسلے میں مجھے بہت سے اونچے نیچے لوگوں سے ملنا پڑتا تھا۔

ایک روز میں سڑک پر پیدل ہی جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک پاگل آتا نظر آیا۔ راولپنڈی کی ٹھنڈ میں وہ صرف میلی سی ایک دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ قمیض نہیں تھی۔ پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی اور سر کے بال بھی بڑھے ہوئے اور بہت گندے تھے۔ وہ کچھ بڑبڑاتا ہوا آرہا تھا۔ رُکتا تھا، آسمان کی طرف دیکھتا تھا اور بڑے زور سے قہقہہ لگا کر بالکل سنجیدہ ہو کر اس طرح اُوپر دیکھنے لگتا تھا جیسے اس کی نظریں اس کے قہقہے کو تلاش کر رہی ہوں۔ ذرا دیر بعد وہ آگے چل پڑتا تھا۔

ایسے پاگل تو گلی گلی پھرتے ملتے ہیں جن کی طرف ہم نے کبھی توجہ نہیں دی اور ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ یہ لوگ پاگل کیوں ہوئے ہیں اور پاگلوں میں اضافہ کیوں ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کوئی شوقیہ تو پاگل نہیں ہوا۔ ہر پاگل ہمارے معاشرے کی ایک دردناک کہانی ہوتا ہے۔ ہم پاگل کو دیکھ کر پرے ہٹ جاتے ہیں اور ہمارے بچے پاگلوں کو پتھر مارتے ہیں۔

خود میں نے کسی پاگل کی طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی مگر اس پاگل کو دیکھ کر میں نے اپنی رفتار آہستہ کر لی۔ ایسے لگا جیسے اس شخص کو میں جانتا ہوں۔ ذہن پر زور دیا۔ یاد کرنے کی کوشش کی کہ اسے کہاں دیکھا تھا لیکن کوئی ایسی صورت یاد نہ آئی۔ پھر میں نے اس خیال سے توجہ ہٹا لی کہ شاید اسی

پاگل کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔

وہ مجھ سے تین چار قدم دُور رہ گیا تو رُک گیا اور بڑے غور سے مجھے دیکھنے لگا۔ پہلے ذرا سا مسکرایا پھر ہنسنے لگا اور جب میں اس کے قریب پہنچا تو اُس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔ میں ٹھٹھک گیا بلکہ ڈر بھی گیا کہ پاگل ہے، کہیں میرے کپڑے ہی نہ پھاڑ دے یا کوئی اور اُلٹی سیدھی حرکت نہ کر دے۔

اس نے مشین گن کی طرح قہقہہ لگایا اور بولا ——— "آؤ نماز پڑھیں۔ آؤ، آؤ۔ ٹھہرو، میں اذان دے لوں"۔ اور اُس نے مغرب کی بجائے مشرق کی طرف مُنہ کر کے اذان جو شروع کی تو سڑک پر چلتے لوگ رُکنے لگے۔ میں اس سے ذرا دُور ہٹ گیا۔ جی میں آئی کہ وہاں سے کِھسک جاؤں لیکن اذان نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ اس قدر پُرسوز آواز کہ میں نے جسم کے اندر رعشہ محسوس کیا اور میرا ذہن پیچھے ہٹنے لگا۔

وہ سڑک پر کھڑا اذان دے رہا تھا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو رہے تھے اور اس کی جادو بھری آواز مجھے گذرے ہوئے وقت میں دُور پیچھے لے گئی۔ یہ اذان اور یہ آواز مَیں نے پہلے بھی سُنی تھی۔ کئی بار سُنی تھی اور اس آواز نے مجھے گناہوں کی دُنیا سے نکالا تھا۔

اچانک میرے سینے میں دھماکہ سا ہُوا۔ مَیں سر سے پاؤں تک لرز گیا اور مجھے یاد آ گیا کہ یہ تو وہی مولوی ہے جس کے ساتھ میں نے اُجڑے ہوئے گاؤں کی مسجد میں نمازیں پڑھی تھیں۔ اِسی نے مجھ سے خدا کے حضور توبہ کروائی اور مجھے جُرم اور گناہ کے خوب صورت جال سے نکالا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کی کہ یہ وہ مولوی نہیں ہے۔ وہ تو مذہب میں ڈوبا ہُوا اور خدا کے حضور ہر لمحہ سجدے کرنے والا انسان تھا۔ وہ پاگل نہیں ہو سکتا مگر اس پاگل نے کوئی دھوکا نہ رہنے

دیا۔ اذان ختم کر کے وہ مجھے اس ہجوم میں ڈھونڈنے لگا جو اُس کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اُس نے مجھے دیکھ لیا اور لپک کر میرا بازو پکڑ لیا۔ کہنے لگا ——— "آؤ نماز پڑھیں" ——— اور اُس نے مشرق کی طرف مُنہ کر کے کہا ——— "اللہ اکبر" ——— ہاتھ کانوں تک لے جا کر ہاتھ اپنے آگے باندھ لیے۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ مَیں وہاں سے اور پیچھے ہٹا اور ہجوم سے نکل گیا۔

دل پر بڑا ہی ناگوار بوجھ آن پڑا اور مَیں اُسی کے متعلق سوچتا اپنے کام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس دن کے بعد وہ مجھے کسی نہ کسی سڑک پر چند ایک بار پھر ملا۔ دو بار تو اُس نے مجھے دیکھ کر بھی نہ پہچانا اور مجھے دیکھتا ہُوا آگے نکل گیا۔ کئی بار وہ میرے سامنے رُک گیا اور اذان شروع کر دی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کہیں تنہائی میں ملے تو اس سے باتیں کروں۔ اسے اپنے گھر لے جانے سے میں گھبراتا تھا۔ گھر میں نوجوان بیوی تھی۔ پاگل کا کیا بھروسہ، نہ جانے کیا کر بیٹھے۔

وہ آخری بار ملا تو اُس نے اذان نہ دی۔ مجھے اپنے پیچھے نماز کے لیے کھڑا نہ کیا۔ میرے سامنے آیا تو مجھے روک کر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پہلے مسکرایا پھر ہنسا اور ہنستے ہنستے اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔ اب وہ ہنس بھی رہا تھا، رو بھی رہا تھا۔

"مولوی صاحب! آپ کو کیا ہو گیا ہے"؟ مَیں نے اس سے پُوچھا۔ "آپ وہی مولوی صاحب ہیں نا؟"

وہ زور سے ہنسا اور بولا ——— "وہ مردُود مر گیا ہے۔ وہ مولوی ..... مر گیا ہے"۔

"میرے ساتھ آیئے"۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کو کپڑے دُوں گا"۔

"کپڑے .... کپڑے"۔ اُس نے بلند آواز سے کہا اور قہقہہ لگا کر آگے کو چل پڑا۔ وہ کہتا جا رہا تھا ——— "کپڑے۔ کپڑے"۔ اور قہقہے

بھی لگاتا جا رہا تھا، پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا، پھر وہ مجھے کبھی نظر نہ آیا۔

۱۹۵۰ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ راولپنڈی کی یخ ٹھنڈ کا عروج تھا۔ دانت بجتے تھے، جسم ٹھٹھرتے تھے اور میں اس پاگل کے متعلق سوچا کرتا تھا کہ وہ اس ٹھنڈ میں کپڑوں کے بغیر اکڑ کر مر جائے گا۔

اپنی فرم کو ایک نیا ٹھیکہ ملا جس کے لیے کچھ سامان خریدنا تھا۔ ایک روز ایک نئی فرم میں سامان کے لیے جانا پڑا۔ فرم کے مالک سے ملاقات ہوئی تو ہم دونو کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہ لگی۔ وہ میرا مُحسن اور سمگلر استاد تھا۔ اُسے دیکھ کر میں کچھ گھبرا گیا۔

"بیٹھو یار، تم تو ڈر گئے ہو" اُس نے میری گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے ہنس کر کہا ــــ "بچھڑے ہوئے مسافر کہیں نہ کہیں مل ہی جاتے ہیں۔ مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں اب سمگلر نہیں۔ شریف آدمی ہوں ..... تم کہاں گھوم رہے ہو؟" ــــ وہ بڑے دوستانہ لہجے میں بولتا رہا ــــ "تم بھاگ گئے خوب تھے۔ یار اتنی خوب صورت عورتیں تمہارے حوالے کر دی تھیں۔ تم بدھو نکلے۔ کہو کیسے گذر رہی ہے؟ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اُسے بتایا کہ اُس کے گاؤں سے بھاگ کر میں کہاں کہاں گھومتا رہا اور اب کیا کر رہا ہوں۔ جب میں نے اپنی فرم کا نام لے کر اُسے بتایا کہ مجھے فلاں فلاں سامان اتنی تعداد میں چاہیئے تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ وہ کاروباری آدمی تھا۔ اتنے بڑے آرڈر سے خوش کیوں نہ ہوتا۔ میری فرم سے وہ واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ فرم کا ایک موٹا گاہک ہے چنانچہ اُس نے میری خوب آؤ بھگت کی۔

وہ میری آؤ بھگت نہ کرتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جو کچھ پہلے تھا یا جو کچھ اب تھا، مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میرے دل میں

اُس کا احترام پیر و مُرشد کی طرح تھا۔ اُس نے مجھے موت کے مُنہ سے نکالا تھا۔ میرا اُس کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ وہ مجھے کشمیر کی اُس وادی میں پڑا رہنے دیتا تو میں کوئی گلہ نہ کرتا۔ میں اُن ہزاروں کشمیری مسلمانوں میں سے ایک تھا جو زخمی حالت میں پاکستان میں پناہ ڈھونڈنے چلے تھے مگر زخموں نے چلنے نہ دیا اور وہ بے گور و کفن جانے کہاں کہاں مر گئے اور اُن کی ہڈیاں جانے کہاں کہاں بکھر گئیں لیکن یہ آدمی مجھے اُٹھا لایا۔ میرا علاج کرایا تھا ورنہ میری لاش کو کشمیر کے بھیڑیے اور گیدڑ کب کے کھا جاتے۔

اُس نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ میں اُس کے گھر گیا، تو اُس کی بیوی بھی بے تکلفی سے ملی۔ خاوند نے اسے میرے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ایک خوب صورت کشمیری عورت تھی۔ اُردو بولتی تھی، لہجہ کشمیر کا تھا۔ حُسن ایسا جو صرف کشمیر میں ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ سرینگر کے علاقے کی رہنے والی تھی۔ اس علاقے کی ہر لڑکی کا رنگ گورا، گال گلابی، آنکھیں شربتی اور بال ریشمی اور بھورے ہوتے ہیں لیکن اس لڑکی میں ان خوبیوں کے علاوہ کوئی ایسی چیز بھی تھی جو دیکھنے والوں کو مسحور کر لیتی تھی۔

ہم تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا اور کشمیر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہم نے کشمیر کی ہر چیز کو بہت یاد کیا اور ایک بار تو میرے محسن کی بیوی کے آنسو نکل آئے۔ اُس کے خاوند نے فوراً موضوع بدل دیا جس سے محفل میں تھوڑی سی شگفتگی پیدا ہو گئی، ورنہ ہم تینوں بہت اداس ہو گئے تھے۔ باتیں ہی ایسی تھیں۔ کشمیر کی ہر یاد خون آلود تھی۔ ہمارا درد مشترک تھا اور یہ شخص میرا محسن بھی تھا، اس لیے ہمارے درمیان ایک مضبوط جذباتی رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کے علاوہ کاروباری تعلق بھی پیدا ہو گیا۔

پھر ہم ملتے رہے اور بے تکلفی بڑھ گئی۔ دونوں میاں بیوی ہر بات

بہت مکمل کر کرتے تھے۔ خاوند نے مجھے بتایا کہ میں جب ان کے ہاں سے
بھاگ آیا تھا اس سے تھوڑا عرصہ بعد اُس نے سمگلنگ چھوڑ دی تھی اِس
پیشے سے اُس نے بہت دولت کمائی تھی۔ اس سے اُس نے راولپنڈی
آکر یہ کاروبار شروع کر دیا جو چل نکلا۔

سمگلنگ چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ جب ڈوگروں نے مسلمانوں پر ظلم و
تشدد شروع کیا تو وہ اسے ہندو مسلم فساد سمجھتا رہا جس سے وہ خوش ہوا
کہ سمگلنگ آسان ہو گئی ہے لیکن کشمیر میں ڈوگرہ راج کے خلاف کشمیری
مسلمانوں نے باقاعدہ جنگ شروع کر دی اور پاکستان کی فوج بھی کشمیری
مجاہدین کی مدد کو آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس آدمی نے کشمیر کے دُور اندر یعنی
مقبوضہ کشمیر میں جا کر دیکھا کہ ڈوگرے کس طرح مسلمانوں کی نسل کو ختم کر رہے
ہیں۔ جب اُس نے نوجوان مسلمان لڑکیوں کو ڈوگروں کے ہاتھوں بے آبرو
ہوتے دیکھا اور جب ننھے ننھے بچوں اور جوان لڑکیوں کی برہنہ لاشیں
دیکھیں تو اس آدمی نے سمگلنگ کی آخری واردات یہ کی کہ اس جواں سال
لڑکی کو سرینگر سے سمگل کر کے پاکستان میں اسی گاؤں میں لے آیا جہاں وہ مجھے
زخمی حالت میں لے گیا تھا۔

اس نے سمگلنگ سے توبہ کر لی۔ اس سے پہلے اس کا یہ غیر قانونی
کاروبار ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھی چلتا تھا۔ وہ لوگ اب بھی اُس
کے ساتھ یہ کاروبار جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن اُس نے انہیں کہہ دیا تھا
کہ ہماری تمہاری خون کی دشمنی ہے۔

اُس نے دو تین مہینے کشمیری مجاہدین اور پاکستان کی فوج کے لیے
جاسوسی بھی کی۔ وہ دوسری طرف چلا جاتا تھا اور اُدھر کی فوج کی نقل و حرکت
متعلق اِس طرف خبریں دیتا تھا۔ وہ چونکہ کشمیر کی وادیوں کا بھیدی تھا،
اس لیے کامیاب جاسوسی کر سکتا تھا لیکن اس لڑکی کو سرینگر سے لے آیا تو

جاسوسی کا کام نہ کر سکا کیونکہ لڑکی کو وہ کہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے
علاوہ اس کے پاس پیسہ تھا جس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سمگلنگ
چھوڑ دینے کی وجہ سے اس کے ساتھی کسی چیز کی حفاظت کے لیے تیار
نہیں تھے بلکہ یہ بھی خطرہ تھا کہ وہ اس لڑکی کو، اس کے پیسے اور زیورات
کو غائب کر دیں گے۔ یہ ایسی مجبوری تھی جس نے اسے میدانِ جنگ میں
ٹھہرنے نہ دیا۔ وہ اس عورت کو اور مال و دولت راولپنڈی لے آیا اور
باعزت کاروبار شروع کر دیا۔

ایک روز باتوں باتوں میں اُس گاؤں کا ذکر چل نکلا تو میں نے اُسے
بتایا کہ اُس گاؤں کی مسجد میں ایک مولوی تھا جسے میں نے راولپنڈی میں
دیکھا ہے۔ وہ پاگل ہو گیا ہے۔

اس آدمی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی نے اُس کی طرف دیکھا۔
آنکھوں آنکھوں میں انہوں نے نہ جانے ایک دوسرے سے کیا کہا کہ دونوں
نے سر جھکا لیے اور اچھی بھلی محفل خاموش ہو گئی۔ میں نے دونوں کو اس
سے پہلے اس سنجیدگی کے عالم میں نہیں دیکھا تھا حالانکہ کشمیر کے متعلق ہم
بڑی دردناک باتیں کرتے رہتے تھے لیکن ان باتوں میں جوش و خروش ہوتا
تھا۔ اب مولوی کی بات ہوئی تو دونوں چپ ہو گئے اور میں کچھ پریشان سا
ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ وہ پاگل ہو گیا ہے"۔ اُس نے کہا اور اپنی بیوی کی طرف
دیکھ کر چپ ہو گیا۔

بیوی نے دبی دبی سی آواز میں کہا —— "وہ تو پہلے ہی پاگل تھا"

اُس کے خاوند نے کہا —— "میرا خیال ہے انہیں سُنا دو"۔ اور مجھ سے
مخاطب ہو کے بولا —— "عجیب کہانی ہے" —— وہ ہنس پڑا لیکن اس
کی ہنسی میں مسرت نہیں ملال تھا۔ اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا

———— "اُس بے چارے کو اس نے پاگل کیا ہے ..... سنا دو عاشی"!

کشمیر کی اس پری چہرہ بیٹی نے کوئی دو گھنٹوں میں مجھے ساری بات سنائی۔ اُس کا خاوند کہانی میں اضافے کرتا رہا اور جب کہانی ختم ہوئی تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایسی دل کش لڑکی کا حُسن سو سال کی عبادت پر سیاہی پھیر سکتا ہے اور کوئی بھی زاہد اور پارسا پاگل ہو سکتا ہے۔

مذہب اور محبت کے تصادم کی یہ داستان اس طرح ہے کہ یہ آدمی میرے بھاگنے کے بعد اپنے کاروبار میں مصروف رہا۔ یہ جواں سال لڑکی جو اب اُس کی بیوی تھی سرینگر کی ایک بہت مہنگی طوائف تھی۔ کشمیر کی جنگ سے پہلے دُنیا بھر کے دولت مند خصوصاً ہندوستان کے راجے مہاراجے اور نواب گرمیوں کا موسم سرینگر میں گزارا کرتے تھے جہاں انہیں عیاشی اور تفریح کا سارا سامان مل جاتا تھا۔ یہ لڑکی اسی سامان کا ایک حسین حصّہ تھی۔ یہ آدمی کئی بار اس کے ہاں ٹھہرا تھا۔ وہ تو گناہوں کی دنیا کا انسان تھا جو دولت اور عورت سے دل بہلاتا تھا لیکن اس لڑکی کے ساتھ اُس کا رویّہ کچھ اور تھا۔

لڑکی اس غلیظ ماحول سے بھاگنا چاہتی تھی مگر ہاتھ تھامنے اور پناہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ سب بھیڑیئے تھے۔

جب کشمیر جنگ کی لپیٹ میں آ گیا تو سری نگر اُجڑ گیا۔ غیر ملکی شہزادے ہندوستان کے راجے مہاراجے اور نواب بھاگ گئے اور اُن کی جگہ ہندوستان کی فوج کے افسر آ گئے۔ انہوں نے اس لڑکی کو زرخرید لونڈی بنا لیا۔ جب یہ آدمی اس لڑکی سے آخری بار ملا تو وہ بہت روئی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے چلے لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے اسے ساتھ نہیں لا سکا تھا۔

اس آدمی نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب ان سے اور اس پیشے سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو رہا ہے۔ اُس نے سب کو یقین دلایا کہ وہ کسی کی مخبری نہیں کرے گا اور کسی قسم کا دھوکہ نہیں دے گا۔ یہ اُس

کے بعد کی بات ہے جب میں وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ وہ اب سمگلنگ کی آخری واردات کرنا چاہتا تھا جو سب سے زیادہ مشکل تھی بلکہ یہ زندگی اور موت کی واردات تھی۔ واردات یہ تھی کہ اُسے سری نگر سے اس لڑکی کو سمگل کر کے لانا تھا۔

سرحد سے سری نگر تک کا علاقہ جنگ کی زد میں تھا۔ ہر ٹیکری پر اور ہر وادی میں فوجیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہندوستان کے لڑاکا ہوائی جہاز اندھا دُھند مشین گن فائرنگ کرتے رہتے تھے اور توپوں کی گولہ باری سے کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ لڑکی اُسے سری نگر میں ملے گی یا نہیں۔ اُس نے اُس کے ساتھ کوئی پروگرام طے نہیں کیا تھا، نہ اس لڑکی کو علم تھا کہ یہ آدمی اُسے لینے آ رہا ہے۔

اُس نے اپنے ساتھیوں کو اس فیصلے سے کہ وہ اُن سے الگ ہو رہا ہے، آگاہ کر کے بے شک یہ یقین دلایا تھا کہ شریفانہ زندگی میں جا کر وہ انہیں دھوکا نہیں دے گا پھر بھی اُس کے ساتھیوں نے اس گاؤں سے اڈہ ہٹا دیا اور کسی دوسری جگہ چلے گئے جس کا اسے کوئی علم نہ تھا نہ اسے اب ان کے اڈوں سے کوئی دلچسپی تھی۔ جانے سے پہلے انہوں نے اسے اس کا حصّہ دے دیا تھا۔ یہ حصّہ سونے کے زیورات اور نقدی کی صُورت میں تھا۔

اپنے ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد وہ اسی اُجڑے ہوئے گاؤں میں رہا۔ پاکستان میں اسے کوئی ایسا آدمی یا ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں وہ زیورات اور رقم چھوڑ کر سری نگر جاتے۔ اُس کے ہم پیشہ تو کئی لوگ تھے لیکن اعتماد کے قابل کوئی نہ تھا۔

گاؤں میں صرف یہ مولوی تھا۔ وہ مسجد میں جا کر مولوی سے ملا۔ مولوی اسے نہیں جانتا تھا۔ اُس نے ارادہ یہ کیا کہ مولوی سے کہے گا کہ

وہ کشمیر سے بھاگ کر آیا ہے اور اب بیوی کو لانے جا رہا ہے اس لیے یہ زیورات اور نقدی امانت رکھ لے مگر مسجد میں بیٹھ کر اُس سے جھوٹ نہ بولا گیا ۔ وہ ایک بے حد خطرناک مہم پر جا رہا تھا ۔ یہ مہم گناہ کی نہیں نیکی کی تھی ۔ اُس نے مسجد میں جا کر محسوس کیا کہ اسے خدا کی مدد کی شدید ضرورت ہے جس کے لیے مولوی صاحب سے دُعا کرانا ضروری ہے ۔ اس پر مسجد کا تقدس ایسا طاری ہُوا کہ اُس نے مولوی کو بتا دیا کہ وہ کل تک سمگلر تھا، اب توبہ کر چکا ہے ۔

مولوی نے خوش ہو کر قرآن کی ایک آیت پڑھی پھر ایک اور آیت پڑھنے لگا اور اسے کہا کہ وہ ساتھ ساتھ الفاظ دُہراتا جائے ۔ جب آیت ختم ہوئی تو مولوی نے اس سے کچھ اور جملے کہلوائے اور خدا کے حضور توبہ کرائی، پھر اسے لمبا چوڑا وعظ سُنا کر کہا کہ یہ زر اور زیورات اگلے جہان انگارے بن کر جسم کے ساتھ لگا دیئے جائیں گے ۔ بخشش صرف توبہ سے نہیں، بلکہ باقاعدہ نماز اور مذہب کی پابندی سے ہو گی ۔

اُس نے مولوی کو بتایا کہ اس توبہ کے بعد وہ جان پر کھیل کر ایک اور نیکی کرنا چاہتا ہے ۔ نیکی یہ ہے کہ وہ سری نگر سے ایک مسلمان لڑکی کو گناہوں کے پیشے سے نکال کر شریفانہ زندگی میں لانے جا رہا ہے ۔ اس کی کامیابی کے لیے دُعا کرانی ہے ۔

مولوی نے ایک کتاب نکالی اور ورق اُلٹنے لگا ۔ ایک صفحے پر رُک کر اُس نے کچھ پڑھا اور سوچ بچار کے بعد اسے بتایا کہ اگر یہ کام نیکی کا ہے تو کامیابی حاصل ہو گی، پھر اُس نے دُعا کی اور اُسے کامیابی کا یقین دلایا ۔

اب اُس نے اصل مقصد بیان کیا ۔ زیورات اور نقدی مولوی کے سامنے رکھ کر کہا کہ یہ امانت چھوڑ چلا ہوں ۔ اگر زندہ واپس آ گیا تو لے لوں گا اگر تین مہینے تک نہ آیا تو اسے چاہے اللہ کا مال سمجھیں چاہے اپنا ۔ میں آپ کو یہ امانت بخش دیتا ہوں ۔

مولوی نے امانت سنبھال لی اور کہا کہ میرا خدا سچا اور میرا علم سچا ہے ۔ تم واپس آؤ گے اور یہ امانت اسی طرح اُٹھا لے جاؤ گے جس طرح چھوڑ چلے ہو ۔

وہ کم و بیش ایک لاکھ روپے کے زیورات اور نقدی مولوی کے پاس چھوڑ کر چل پڑا ۔ اس کے پاس ایک ریوالور، چوبیس گولیاں اور ایک خنجر تھا ۔ پہاڑی بھول بھلیوں سے تو وہ خوب واقف تھا مگر سارے علاقے میں بکھری ہوئی فوجوں اور مورچوں میں سے گزر کر سری نگر تک پہنچنا ناممکن نظر آتا تھا ۔ وہ چلتا چلا گیا اور دُور دُور کا چکر کاٹ کر نویں روز سری نگر والی سڑک پر جا پہنچا ۔ پا پیادہ ہندو سمگلروں کے اڈے پر گیا ۔ سمگلر صرف سمگلر ہوتے ہیں، وہ ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلمان نہیں ہُوا کرتے ۔ اُس نے اپنے ہندو ساتھیوں کو "مال" کا جھانسہ دے کر سری نگر تک پہنچنے کے لیے مدد مانگی جو اسے دے دی گئی ۔

سری نگر پہنچتے ہی وہ اس لڑکی کے گھر پہنچا ۔ دن کا وقت تھا ۔ وہ سوئی ہوئی تھی ۔ اُس نے اسے جگایا اور کہا کہ وہ اُسے لینے آیا ہے ۔ اس لڑکی کے دو نوکر تھے ۔ دونوں مسلمان تھے ۔ اُس نے ایک نوکر کے کپڑے پہن لیے اور منہ سر پھٹے پرانے کمبل میں چھپا لیا ۔ رات کے وقت باہر گھومنا پھرنا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ جنگ کی وجہ سے رات کو باہر گھومنے والے شہریوں کو فوج کے سنتری روکتے اور پوچھ گچھ کرتے تھے ۔ وہ اُسی وقت نکل کھڑے ہوئے اور شام کا اندھیرا گہرا ہونے تک سری نگر سے بہت دُور نکل گئے ۔

سری نگر سے سرحد تک وہ جس طرح لڑکی کو ساتھ لایا وہ ایک لمبی کہانی ہے ۔ مختصر یہ کہ وہ اسے نکال لایا ۔ آدھے سے زیادہ راستہ وہ اسے کندھوں پر اُٹھا کر لایا تھا ۔ رات کا وقت تھا جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے ۔ گاؤں بدستور اُجڑا ہُوا تھا ۔ سرحد کے ساتھ ساتھ ایسے سارے ہی گاؤں اُجڑ گئے تھے کیونکہ ہندوستانی ہوائی

جہاز معلوم نہیں کس شک کی بنا پر کسی نہ کسی گاؤں پر راکٹ یا مشین گنیں فائر کر جاتے تھے۔

صبح ہوئی تو وہ عقیدت مندی سے مولوی سے جا ملا۔ مولوی نے پہلا کام یہ کیا کہ امانت اس کے آگے رکھ دی۔ اس نے مولوی سے کہا — "قبلہ! یہ ابھی اپنے پاس رکھیں، میں آپ کے پاس ایک اور امانت چھوڑے جا رہا ہوں۔ یہ امانت وہی ہے جسے میں جہنم سے نکال کر لایا ہوں"۔

اُس کا ارادہ یہ تھا کہ کہیں کاروبار کا بندوبست ہو جائے اور کہیں ٹھکانہ بن جائے تو اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے۔ اس کے دوست آشنا تو بہت تھے لیکن اب وہ باعزت شہری کی طرح نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے لڑکی کو ویران گاؤں کے اِسی مکان میں چھوڑا اور مولوی سے کہا کہ وہ رات مکان میں سویا کرے۔ مولوی نے یہ امانت بھی قبول کر لی۔ وہ راولپنڈی چلا گیا۔

راولپنڈی میں اُس کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ اُس نے کاروباری دوستوں سے مل کر ایک کاروبار کا بندوبست کر لیا۔ مکان بھی لے لیا اور لڑکی کو لانے کے لیے چلا گیا۔ ان انتظامات میں اُسے دس روز لگ گئے۔ جب وہ گاؤں پہنچا تو وہاں ایک انقلاب آ چکا تھا۔ لڑکی بہت پریشان تھی اور کچھ ڈری سہمی ہوئی تھی۔ اُس نے اس آدمی کو دس دنوں کی روئیداد کہہ سنائی۔

قِصّہ یوں ہوا کہ جس روز یہ آدمی راولپنڈی چلا گیا، اُس رات مولوی اس کے گھر آیا۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ رات مولوی مکان میں اُس کی حفاظت کے لیے سوئے گا۔ مولوی سر جھکائے ہوئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ لڑکی پردہ نشین نہیں تھی۔ وہ بھی اسی کمرے میں چلی گئی۔ لڑکی کے بیان کے مطابق مولوی نے اسے دیکھا تو تھوڑی دیر اسے دیکھتا ہی

رہا۔ لڑکی نے یہ پوچھ کر اسے چونکا دیا کہ کیا آپ اس کمرے میں سوئیں گے؟

"ہاں، تم دوسرے کمرے میں سو جانا۔ ڈرنا نہیں"۔ مولوی نے جواب دیا — "تھوڑی دیر میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمہارے ساتھ دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔

لڑکی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی — مولوی نے ایک وعظ شروع کر دیا جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ خدا نے عورت کو پیار اور پاکیزگی کا مجسمہ بنا کر زمین پر اُتارا تھا لیکن خدا کے بندوں نے اس مجسّمے کو کھلونا بنا کر اسے ناپاک کر دیا ہے۔ خدا نے تمہاری نجات کے لیے ایک فرشتہ اتارا ہے جو تمہیں گناہوں کے دوزخ سے نکال لایا ہے۔ تم اب پاک ہو اور خدا کے حضور سجدے میں گر کر التجا کرو کہ اس کی ذات تمہیں اس جہنم سے بچائے رکھے۔ مولوی نے اسے صوم و صلوٰۃ کے فضائل بتائے پھر اسے ایک وظیفہ بتایا اور کہا کہ یہ سوا لاکھ بار پڑھو۔ خدا تمہیں سدا پاک رکھے گا۔

لڑکی کو مولوی کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اُس نے خدا اور رسولؐ کا نام تو کئی بار سنا تھا مگر اُس پر جو تاثر مولوی نے طاری کر دیا تھا اِس سے اُسے پہلی بار خدا اور رسولؐ کی عظمت کا احساس ہُوا۔ اُس نے مولوی سے رُوح کی پاکیزگی کے متعلق باتیں پوچھیں جو مولوی نے اسے ایسے اثر انگیز انداز سے بتائیں کہ لڑکی اپنے آپ کو پاک صاف سمجھنے لگی اور کچھ ایسا محسوس کرنے لگی جیسے اس مقدّس انسان نے اسے غلاظت سے نکال لیا ہو۔ وہ رات بہت دیر تک اُس سے باتیں پوچھتی اور سُنتی رہی۔

دوسرے دن مولوی اسے مسجد میں لے گیا اور اس سے اپنے مخصوص طریقے سے توبہ کرائی پھر اسے گھر لے گیا۔ اب کے لڑکی اس کے سامنے بہت قریب ہو کر بیٹھی۔ مولوی اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ رات کو بھی باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزرا پھر ایک اور رات آئی۔

باتیں سنتے سناتے لڑکی اسی کمرے میں سوگئی۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھُل گئی۔ اس نے دیکھا کہ مولوی اس کی چارپائی کے پاس فرش پر بیٹھا تھا۔ لالٹین جل رہی تھی۔ مولوی کا ایک ہاتھ لڑکی کے بالوں پہ تھا اور دوسرا ہاتھ لڑکی کے ہاتھ پر پھیر رہا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ لڑکی کی آنکھ کھل گئی ہے تو وہ گھبرا گیا اور چونک کر دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔ اچھا ہوا کہ لڑکی نے مولوی کو آنکھ کھُلتے ہی پہچان لیا ورنہ ڈر کے مارے اس کی چیخیں نکل جاتیں۔

وہ اُٹھ کے بیٹھ گئی اور احترام سے مولوی سے کہا کہ چارپائی پر بیٹھ جائیں۔ وہ کوئی سیدھی سادی بدھوسی لڑکی تو نہیں تھی کہ یہ بھی نہ سمجھ سکتی کہ مولوی اس کے پاس کیوں آبیٹھا تھا۔ اس لڑکی نے حُسن کے طلسم سے پتھر دل مردوں کو انگلیوں پر نچایا تھا۔ وہ مرد کی کمزوریوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ پھر بھی وہ مولوی کا احترام کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے اُس کے ساتھ ایسے پیارے انداز سے باتیں کیں کہ مولوی کی گھبراہٹ دُور ہوگئی۔

وُہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ذرا دیر بعد آہ بھر کر بولا ——"ایک روز سُورج سوا نیزے پر آکر اس زمین کو جلا ڈالے گا کیونکہ اس زمین پہ خدا کا حُسن گناہگار بندوں کے ہاتھوں نیلام ہوتا ہے۔ اس سے بڑا گناہ اور کیا ہوگا..... لڑکی! تم بہت خوب صورت ہو" —— اور وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اُس نے رات دوسرے کمرے میں گزاری۔ دن کے وقت وہ لڑکی سے جھینپتا رہا۔ تھوڑی دیر اُس کے پاس بیٹھا۔ باتیں بھی کیں لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کا دماغ حاضر نہیں۔ رات کی نماز پڑھ کر آیا تو بھی وُہ کھویا کھویا تھا۔

لڑکی سوگئی اور کچھ دیر بعد گزشتہ رات کی طرح اس کی پھر آنکھ کھُل

گئی۔ اس نے دیکھا کہ مولوی فرش پہ دوزانو بیٹھا اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں اُس کے ہاتھ کو تھام رکھا تھا۔ لڑکی آخر طوائف تھی، مردوں کی دُکھتی رگوں کو سمجھتی تھی۔ اُس نے بڑے پیارے لہجے میں مولوی سے کہہ دیا ——" مولوی صاحب! میرے اس پاپی جسم کے ساتھ جانے کتنے مرد کھیل چکے ہیں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ میں آپ جیسے پاک انسان کو بھی ان مردوں کی قطار میں کھڑا دیکھوں۔ میرے جسم کو آپ نے مسجد میں لے جا کر پاک کیا ہے"۔

جس طرح لڑکی نے کھل کر بات کہہ دی تھی اسی طرح مولوی نے بھی اپنا دل کھول کر لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔ وہ گزشتہ رات کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"گھبرائیے نہیں"۔ لڑکی نے اسے کہا۔ "میرے پاس بیٹھ کر بات کریں۔ میں آپ سے ڈرتی نہیں۔ عورت کو صِرف ایک ڈر ہوتا ہے کہ کوئی غیر مرد عزت پہ نہ ہاتھ ڈال دے۔ مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں کیونکہ میں اپنی عزت نیلام کر چکی ہُوں"۔

مولوی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ لڑکی کی بے باکی نے اسے حوصلہ دیا اور وہ ایسے لہجے میں بولا جس میں درد تھا اور شکست۔ کہنے لگا ——

"میری پوری بات سُنو گی لڑکی!... سُن کر میرے مُنہ پر تھوک دینا... میں گناہگار ہوں، زندگی میں تم پہلی عورت ذات ہو جسے چھُوا ہے۔ مجھے معلوم نہیں، میں نے کس نیت سے چھُوا تھا۔ میں زہد اور پارسائی کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا انسان ہوں۔ کل تمہارے بالوں پر ہاتھ رکھا اور تمہارے سوئے ہوئے جسم کو چھُوا تو مجھ پہ انکشاف ہُوا کہ میں پارسا انسان نہیں، صرف انسان ہوں۔ میں نے یہ گناہ کیوں کیا"؟

لڑکی نے بتایا کہ اس کی آواز رُندھ گئی۔ ہلکی سی ہچکی لے کر کہنے لگا

—— "میں نے ماں نہیں دیکھی، میری کوئی بہن نہیں تھی، خالہ اور
پھوپھی بھی کوئی نہیں تھی۔ میں نے کسی عورت کا دودھ نہیں پیا۔ کسی عورت
کے ہاتھوں نے مجھے اٹھایا نہیں، سینے سے نہیں لگایا، مجھے چھوا نہیں
اور باپ نے مجھے عورت سے ڈرائے رکھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مرد عورت
کے سائے سے بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ اُس نے مجھے وظیفے سکھائے،
مجھ سے بچپن میں چلّے کٹوائے اور وہ تعویذ یاد کرائے جو لوہے کو سونا بنا
دیتے ہیں اور جن سے انسان صرف انسانوں کا ہی نہیں جنّوں کا بھی امام
بن جاتا ہے"۔

اُس نے چھت کی طرف دیکھ کر گہری آہ بھری اور بولا —— "ہاں
لڑکی! تم مجھے اپنے گاہکوں کی قطار میں شامل کر سکتی ہو۔ میں گناہگار ہوں۔
تمہارے جسم کو چھو کر میں پارسا اور زاہد نہیں رہا مگر میری بات سُن لو۔ میں
ایک مُدت سے یہ وظیفے پڑھ رہا ہوں، چلّے کاٹ رہا ہوں۔ دُنیا سے
منہ موڑ لیا ہے۔ ان وظیفوں اور چلّوں کی شرط یہ ہے کہ عورت کا سایہ بھی نہ
پڑے مگر میں نے تمہارا سایہ اپنے اوپر ڈال لیا ہے۔ کل رات جب تم
سو گئی تھیں تو میں نے تمہارے بھولے بھالے چہرے کو دیکھا تو مجھے ایک
دودھ پیتی بچی دکھائی دی۔ تمہارے بازو اور بال دیکھے تو مجھے بہن نظر آئی
اور جب تمہارے سینے پر نظر پڑی تو میں نے تمہیں ماں سمجھا اور جب تمہیں
سر سے پاؤں تک دیکھا تو میرا سارا وجود کانپنے لگا۔ میں بے بس ہو گیا۔
تمہارے سوئے ہوئے وجود میں مجھے معصوم بچی، بہن، ماں اور وہ عورت
نظر آئی جس سے مجھے باپ ہمیشہ ڈراتا بھی رہا تھا اور یہ بھی کہا کرتا تھا کہ
عورت پاکیزگی اور پیار کا مجسمہ ہوتی ہے....

"میرا جسم یک لخت سُوکھ گیا اور مجھے ایسی پیاس محسوس ہونے لگی
جو پانی سے نہیں بُجھا کرتی اور جسے میں بھی نہ سمجھ سکا کہ کیسے بُجھے گی۔ میں

اندر ہی اندر جلنے لگا پھر میں اُس وقت چونکا جب تمہاری آنکھ کھل گئی اور
میرا ایک ہاتھ تمہارے بالوں پر اور دوسرا تمہارے ہاتھ پر تھا۔ میں نے
کسی ارادے اور فیصلے سے تمہارے جسم کو نہیں چھوا تھا۔ کسی قوت نے
مجھے تمہاری طرف دھکیلا اور گھسیٹا تھا"۔

اُس کے آنسو نکل آئے۔ ہاتھوں سے آنسو پونچھ کر کہنے لگا ——
"میں گمراہ ہو گیا ہوں لڑکی! تمہارے اتنے پیارے پیارے، باریک
باریک بالوں نے وہ مضبوط زنجیریں توڑ ڈالی ہیں جن میں مجھے باپ نے
باندھ دیا تھا..... تم جاگ اٹھیں تو میں کمرے سے نکل گیا۔ تم نے سوچا
ہو گا کہ میں دوسرے کمرے میں چلا گیا ہوں۔ نہیں۔ میں مسجد میں چلا گیا
تھا۔ میں نے قرآن کھولا پھر وہ کتاب کھولی جس میں جن و انس کا امام بننے
اور لوہے کو سونا بنانے والے طریقے لکھے ہوئے ہیں۔ میرے سینے میں
ایک روشنی سی چمکی جس نے مجھے یہ دکھایا کہ باپ نے مجھے ایسے تعویذ سکھائے تھے
جن میں قرآن کی آیات اُلٹی لکھی جاتی ہیں۔ میں نے تیس سال کی عمر میں پہلی
بار سوچا، کیا قرآن کو اُلٹا لکھو تو اثر دکھاتا ہے؟ اگر ایسے ہی ہے تو خدا نے
اسے سیدھا کیوں لکھا تھا؟....

"میں نے سوچا کہ کیا قرآن کالے جادو کی کتاب ہے؟ پھر یہ خیال آیا
کہ باپ نے مجھے سونے چاندی سے، دنیا سے اور عورت سے نفرت
سکھائی تھی مگر مجھے وہ وظیفے بتائے جن کے اثر سے لوہا سونا بن جاتا ہے
..... اور لڑکی! میں رات بھر سوچوں کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔
رات کے آخری پہر سب سے زیادہ پیچیدہ سوال یہ ذہن سے اُٹھا ——
مذہب کیا ہے؟ —— یہ جو مجھے باپ نے سکھایا تھا؟ ٹُونے ٹوٹکوں اور
تعویذوں والا؟ جس میں کسی کو قتل کرنے کے تعویذ شامل ہیں؟ جس میں
کسی لڑکی کو پھانسنے کے لیے بھی تعویذ شامل ہیں؟ اور ہر تعویذ پر قرآن کے

مقدس الفاظ لکھے جاتے ہیں ـــــ یہی کچھ سوچتے سوچتے سحر ہوگئی۔
عادت کے مطابق میں نے وضو کیا اور اذان دی۔ میں نے بڑی مشکل سے
اذان پوری کی۔ منہ سے الفاظ نکلتے نہیں تھے۔ پھر میں نماز کے لیے
کھڑا ہوگیا اور سچے خدا کو سامنے رکھ کر نماز جو پڑھی تو مجھے سکون محسوس
ہُوا پھر میں نے قرآن کی تلاوت کی۔ اس سے پہلے میں نے قرآن کے
معنی کبھی نہیں پڑھے تھے لیکن کل صبح میری نظر معنی پر پڑ گئی اور میں نے
کئی جگہوں سے معنی پڑھے تو کچھ سوال حل ہوگئے اور کچھ نئے سوال پیدا
ہوگئے ..... اور اب میں بھٹک رہا ہوں۔ آج رات پھر تمہارے پاس آ
بیٹھا۔ مجھے آج بھی تمہارے وجود میں دودھ پیتی بچی، بہن، ماں اور وہ عورت
نظر آئی جس سے باپ مجھے ڈراتا بھی رہا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ عورت پیار
اور پاکیزگی کا سرچشمہ ہوتی ہے ..... میں اُس پیاس کی بات کر رہا تھا
جو تمہیں دیکھ کر محسوس ہوئی تھی۔ تمہارے جسم کو چھُوا تو پیاس کی تلخی کم
ہوگئی۔ میں تمہیں یقین نہیں دلا سکتا کہ میری نیت بُری تھی یا اچھی۔ تم نے
مرد کو صرف ایک ہی رُوپ میں دیکھا ہے۔ میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں
آئے گی۔ مجھے گناہگار کہ لو، شیطان کہ لو۔ تم خوب صورت لڑکی ہو اور
میں مرد ہوں۔"

لڑکی نے سنایا کہ وہ بہت دیر تک ایسی ہی اُلجھی اُلجھی اور اُکھڑی اُکھڑی
باتیں کرتا رہا پھر سر جھُکا کر آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔ اگلی رات اس کی باتیں
اور زیادہ اُکھڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے کئی بار کہا ـــــ "قرآن کیا ہے؟
..... کالے جادو کی کتاب یا مجھ جیسے گمراہوں کو راستہ دکھانے والی روشنی؟
..... باپ کچھ اور کہتا تھا قرآن کچھ اور کہتا ہے"۔

مختصر یہ کہ وہ بھٹک گیا تھا۔ دو روز بعد پتہ چلا کہ لوہے کو سونا بنانے
والا جو وظیفہ پڑھ رہا تھا وہ اُس نے ترک کر دیا ہے اور اب اس کی عبادت
نماز اور تلاوت تک رہ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اب لڑکی کے

بہت قریب ہوتا جا رہا تھا۔

لڑکی اس سے ذرا گھبرانے لگی۔

اُس آدمی کے واپس آنے سے دو روز پہلے کی بات ہے کہ رات
کے وقت مولوی نے لڑکی کے ہاتھ پکڑ لیے اور بے اختیار ہو کر ہاتھوں کو
چُومنے لگا پھر لڑکی کے سامنے فرش پر گھٹنے ٹیک کر سر اُس کی گود میں رکھ کر
ہچکیاں لے لے کے رونے لگا۔ لڑکی چارپائی پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ
اُس کے پاؤں فرش پر تھے۔ مولوی نے اُس کی گود سے سر اُٹھا کر اُس
کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور چُومنے لگا۔ وہ رو رو کر کہنے لگا ـــــ "جنّت
ماں کے قدموں میں ہوتی ہے۔ لڑکی مت ڈرو۔ مجھے اپنی ماں کے قدم چومنے
دو۔ مجھے جہنّم سے نکالو لڑکی، مجھے جنّت دیکھ لینے دو"۔

لڑکی بہت گھبرائی۔ اگر مولوی اُس سے جنسی آسودگی کی بھیک مانگتا
تو لڑکی شاید ڈر کر اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیتی مگر مولوی پر کوئی ایسا جنون
طاری تھا جسے لڑکی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ مولوی نے کوئی نازیبا حرکت نہ کی۔
لڑکی کے ہاتھوں اور پاؤں کے سوا کسی اور حصے کو ہاتھ نہ لگایا۔ لڑکی کو یہ
یقین ضرور تھا کہ مولوی کی نیّت عام مردوں والی نہیں۔

اُس نے لڑکی کے پاؤں چھوڑ کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں
تھام کر اُداس اُداس سی ہنسی اور ولولے سے پیار سے کہا ـــــ "مجھے خدا کا
نور دیکھ لینے دو۔ مجھے بچی کا منہ دیکھ لینے دو۔ مجھے بہن کا مُنہ دیکھ لینے
دو ..... آہ ..... پیاس بُجھ رہی ہے"۔ وہ سکون کی آہ لے کر اُٹھا
اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے دن وہ لڑکی کے سامنے آ بیٹھا اور اسے بڑے غور سے
دیکھتا رہا۔ کبھی مُسکرا دیتا کبھی اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ لڑکی کو اُس کی
خاموشی ڈرا رہی تھی۔ اُس نے راجوں مہاراجوں اور نوابوں کو اپنا غلام بنا

لیا تھا مگر یہ مرد اُس کے لیے بد رُوح بن گیا تھا۔

اُسی شام میرا دوست گاؤں پہنچ گیا۔ لڑکی ڈری ہوئی تھی۔ اُس نے اسے مولوی کے متعلق ساری بات کہ سُنائی۔ وہ ہنس پڑا اور کہا کہ ہم صُبح یہاں سے چلے جائیں گے۔ رات کے وقت وہ مسجد میں گیا۔ مولوی سر جُھکائے بیٹھا تھا۔ اس آدمی نے مولوی سے کوئی گلہ شکوہ نہ کیا۔ صرف اتنا کہا کہ مولوی صاحب، آپ سے امانت اور اجازت لینے آیا ہوں۔

مولوی مسجد کے کونے سے زیورات اور نقدی اُٹھا لایا اور اُس کے سامنے رکھ کر کہنے لگا ——"تم یہ امانت لے جا سکتے ہو، دوسری نہیں"۔

میرے دوست کو لڑکی ساری بات سُنا چکی تھی۔ اُس نے مولوی کو ٹالنے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور وہاں سے اُٹھ آیا۔ اُس نے مولوی کی ذہنی حالت کا اندازہ کر لیا تھا۔ صبح سویرے وہ لڑکی کو ساتھ لیے باہر نکلا تو دیکھا کہ مولوی دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی جو اُس نے شاید کسی اُجڑے ہوئے گھر سے اُٹھا لی تھی۔ مولوی کی آنکھیں لال سُرخ تھیں۔ سر ڈول رہا تھا —— وہ پاگل ہو چکا تھا۔ اُس کے اندر جو کشمکش تھی اُس کی شدّت اس کے چہرے اور انداز سے دکھائی دے رہی تھی۔

اُس نے کلہاڑی تان کر بدمست شرابی کی طرح کہا —"تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ یہ تمہاری امانت نہیں...... یہ خدا کی امانت ہے"۔

میرے دوست نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن مولوی اب اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ سمجھنے کی حدود سے باہر چلا گیا تھا۔ کلہاڑی اُوپر کر کے آگے آ گیا۔ اُس وقت میرے دوست نے سوچا کہ معاملہ سنگین ہے۔ اُس نے ریوالور نکال لیا اور ہوا میں ایک گولی فائر کر کے کہا —— "مولوی صاحب! آپ کے قتل کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ یہاں گولی کی آواز سُننے

والا کوئی نہیں۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ"۔

"چلاؤ گولی"۔ مولوی نے کہا۔ "میرے سینے میں مارو۔ میں ماروں گا اور مروں گا"۔

میرا دوست اُسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُس کی دماغی حالت بگڑ چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مولوی کو سنبھال لے گا۔ اتنے میں مولوی نے آگے کو جست لگا کر کلہاڑی کا وار کیا۔ لڑکی پیچھے تھی۔ وہ دوڑ کر اندر چلی گئی۔ میرا دوست پھرتیلا تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ کلہاڑی دیوار میں لگی۔ دیوار مٹی کے لیپ والی تھی۔ کلہاڑی لیپ میں اُتر گئی۔ میرے دوست نے پہلو سے مولوی کی کنپٹی پر پوری طاقت سے گھونسہ مارا۔ مولوی لڑکھڑا کر پرے کو گرنے لگا۔ میرے دوست نے اُسے سنبھلنے کی مہلت نہ دی اور اُچھل کر اُس کے پہلو میں ٹھُڈ مارا۔ مولوی کے ہاتھ سے کلہاڑی گر پڑی۔ وہ پھُرتی سے اُٹھا لیکن میرے دوست نے اُسے اسی کنپٹی پر ایک اور گھونسہ مارا جس سے مولوی کا سر ڈولا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا پھر ایک پہلو کے بل گر کر بے ہوش ہو گیا۔ کنپٹی کی ضرب اتنی جلدی ہوش میں نہیں آنے دیتی۔

میرا دوست لڑکی کو ساتھ لیے چل پڑا۔ وہ بہت تیز تیز چلنے لگے۔ دن کا پچھلا پہر تھا جب وہ گجرات بسوں کے اڈے پر پہنچے۔ وہ بس میں سوار ہونے لگے تو میرے دوست نے مولوی کو دیکھا۔ وہ بس کی طرف آ رہا تھا لیکن ابھی دور تھا، بس تک پہنچتے بس چل پڑی۔

راولپنڈی آ کر میرے دوست نے اس لڑکی کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی اور کاروبار شروع کر دیا۔ کوئی تین مہینے بعد اُس نے مولوی کو اس حالت میں راولپنڈی میں دیکھا جس میں اُسے میں نے دیکھا تھا۔ وہ بالکل پاگل ہو چکا تھا۔ اُس نے میرے دوست کو شاید پہچان لیا تھا۔ اُس نے

زور سے قہقہہ لگایا پھر بالکل سنجیدہ ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا دوست آگے نکل گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہونے لگا تو دیکھا کہ مولوی اس کے پیچھے پچیس تیس قدم کے فاصلے پر آرہا تھا۔

میرا دوست رُک گیا اور مولوی اس کے پاس آن رُکا۔ وہ سنجیدہ تھا۔ چُپ تھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میرا دوست اندر چلا گیا۔ اپنی بیوی کو بتایا تو وہ باہر نکل آئی۔ مولوی نے اُسے دیکھا تو اسی طرح سنجیدہ، چُپ چاپ آگے بڑھا۔ لڑکی کے سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔ اُس کے پاؤں چھُوئے اور اُٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔ ایک روز پھر وہ میرے دوست کے پیچھے پیچھے اُس کے گھر تک پہنچا۔ لڑکی باہر نکلی۔ مولوی نے اُس کے پاؤں چھُوئے پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی حسرت سے دیکھتا رہا اور چلا گیا۔

پندرہ بیس روز بعد وہ ایک جگہ میرے دوست کے آمنے سامنے آ گیا۔ اُس نے قہقہہ لگایا لیکن اس کے پیچھے جانے کی بجائے دُوسری طرف چلا گیا۔ اُس کا پاگل پن بڑھتا جا رہا تھا پھر وہ گھر تک کبھی نہ آیا۔

یہ کہانی سننے کے کوئی ایک مہینہ بعد محض اتفاق کی بات ہے کہ میں تانگے پر کچہری کی طرف سے چک لالہ کی طرف جا رہا تھا کہ پُل پر کئی لوگوں کو کھڑے دیکھا، وہ نیچے دیکھ رہے تھے۔ میں نے تانگہ رُکوا لیا۔ اُتر کر نیچے دیکھا۔ نیچے بھی کئی آدمی کھڑے تھے۔ مجھے نالے کے کنارے ایک لاش پڑی نظر آئی۔ پُل بہت اُونچا تھا۔ مَیں نے لاش کو اتنی بلندی سے پہچان لیا پھر بھی میں دوڑتا ہُوا نیچے گیا اور لاش کو اچھی طرح دیکھا۔ وہ مولوی کی لاش تھی۔ ایک تھانیدار اور دو سپاہی پاس کھڑے تھے۔ ایک آدمی نے بتایا کہ یہ ایک پاگل تھا۔ کوئی دو گھنٹے گذرے اس نے پل سے سر کے بل چھلانگ لگا دی تھی، مر گیا ہے۔

میں نے شام کو اپنے دوست اور اُس کی بیوی کو جا کر بتایا تو بیوی کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگی —— "وہ پاگل تھا، بدنیت نہیں تھا"۔

اس حادثے کے پندرہ سال بعد میرا دوست انتڑیوں کی کسی بیماری سے مر گیا اور دو تین مہینے گزرے اس کی بیوی بھی مر گئی ہے۔ ایک تو خاوند کا صدمہ اُسے لے ڈوبا، دوسرے یہ دُکھ کہ اس کے دو بچے پیدا ہوئے تھے۔ ایک پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا اور دُوسرا تین مہینے کا ہو کے مر گیا تھا۔

مَیں نے بیوی کو خاوند کے پہلو میں دفن کرایا تھا۔ مولوی کے متعلق کچھ پتہ نہیں کہ کہاں دفن ہُوا تھا۔

مندر سے مسجد تک

مُنّو تایا کی عمر اُن کے حساب کے مطابق ستّر سال بنتی ہے۔ چہرے کی حالت اور جسمانی کمزوری بتاتی ہے کہ عمر اس سے دو ایک سال کم ہو سکتی ہے، زیادہ نہیں۔ ہم زراعت کے محکمے کی طرف سے دیہات میں ایک زراعتی سروے کے لیے گئے تھے۔ ایک رات ایک گاؤں میں قیام کرنا پڑا۔ دیہاتی گپ شپ اور کہانیاں سُننے اور سنانے کے شوقین ہوتے ہیں۔ رات کھانا کھا کر چوہدری کی بیٹھک میں بہت سے دیہاتی جمع ہو گئے۔ گپ شپ چل پڑی۔

اِس دوران ایک بوڑھا اندر آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ ہمارے میزبان چوہدری نے اُسے آگے آنے کو کہا۔ اُس نے ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا پھر ہم تینوں مہمانوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ چوہدری نے ہمیں کہا "آپ شہری ہیں، کالجوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ نے انگریزی اور اردو اور عربی فارسی کی بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ ذرا اس کی بھی کہانی سنیں۔ سولہ آنے سچّی کہانی ہے" ــــ اور اُس نے بوڑھے سے کہا ــــ "سُناؤ مُنّو تایا"۔

مَیں یہ کہانی مُنّو تایا کی زبان میں سُناتا ہوں۔ اپنی طرف سے صرف یہ تبصرہ کروں گا کہ اِسی گاؤں کے بہت سے لوگ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ انہوں نے تصدیق کی کہ یہ کہانی سچّی ہے۔ میری اور

میرے دونوں دوستوں (انور بیگ اور اکرام) کی رائے یہ ہے کہ یہ واقعہ ناقابلِ یقین نہیں، سچا ہوسکتا ہے۔

منّو تایا پہلے تو مسکرائے پھر کہنے لگے ——— "میں ہندوستان کے دُور اندر گنگا جمنا کے کنارے شہر الٰہ آباد میں ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ میرا نام منوہر لعل رکھا گیا۔ میری چار بہنیں تھیں۔ دو بڑی دو چھوٹی۔ لڑکا میں اکیلا ہی تھا۔ باپ تجارت کرتا تھا۔ بہت مالدار تھا۔ اُس نے مجھے اُسی طرح پالا پوسا جس طرح بیوقوف ماں باپ اکلوتے بیٹے کو پالا کرتے ہیں گھر میں دولت تھی۔ میں سونے چاندی میں کھیل کر بڑا ہوا۔ گھر میں میری حکومت تھی۔ اُس زمانے میں تعلیم کی کوئی قدر اور ضرورت نہیں تھی۔ میرے باپ نے اتنی سی تعلیم کی ضرورت سمجھی کہ حساب کتاب سیدھا کرنا اور لکھنا پڑھنا سیکھ لوں اور باپ کی دکان پر بیٹھوں۔۔۔۔۔

"پنڈتوں اور جوتشیوں نے میری جنم پتری نکالی وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اُس وقت میں نادان تھا۔ عقل جاگی تو ماں نے بتایا کہ جنم پتری میں یہ نکلا تھا کہ پاؤں میں چکر ہے۔ سفر بڑی دُور کا ہے۔ کالی گھٹا سے چاند نکلے گا۔ بچہ اندھیرے میں جائے گا پھر چاند کی طرح گھٹا سے نکل جائے گا۔۔۔۔۔

"میرے باپ نے بہت سے پنڈتوں اور جوتش کے اُستادوں سے پوچھا کہ اس جنم پتری کا مطلب کیا ہے۔ کسی نے کہا دُور کا سفر ولایت (انگلینڈ) کا ہوگا اور گھٹا سے چاند نکلنا دولت اور قسمت کی نشانی ہے۔ اور کسی نے کہا کہ بچہ سارے ہندوستان میں سفر کر کے تجارت کرے گا اور دولت میں کھیلے گا۔۔۔۔۔

"مگر میں بڑا ہوا تو تجارت اور تعلیم کے نام سے بھی مجھے غصہ آجاتا تھا۔ میں کھیل کود اور پیسے کھانے میں خوش ہوتا تھا۔ باپ مجھے پیسے دے دے کر راضی کرتا تھا۔ میں کبھی سکول جاتا کبھی نہ جاتا، اور میں اسی طرح جوان ہو گیا۔ باپ دکان پر بٹھاتا تھا تو میں پیسے اُڑا کر کھسک جاتا تھا۔ میرا یارانہ

مسلمان لڑکوں کے ساتھ تھا۔ مسلمان غریب تھے اور ان میں دو لڑکے امیر بھی تھے۔ وہ اکٹھے کھیلتے تھے۔ خوش رہتے تھے۔ وہ زمانہ پیار اور محبّت کا تھا۔ ہر آدمی دوسروں سے پیار کرتا تھا اور ہر کسی کے دُکھ سُکھ میں شریک رہتا تھا۔ گھروں سے یہی سبق بچّوں کو ملتا تھا۔۔۔۔۔

"ہندو لڑکے چھوٹی عمر میں بھی تجارت اور کاروبار کی باتیں کرتے تھے۔ مسلمان لڑکوں میں یہ عادت تھی کہ ایک لڑکا ایک پیسے کے چنے لیتا تو سب کو دیتا تھا۔ ہندو لڑکے ایک دوسرے کو بتاتے تھے کہ میں نے اتنے پیسے جوڑ لیے ہیں۔ وہ مسلمان بچّوں کی طرح ہنستے کھیلتے اور کودتے پھلانگتے بھی نہیں تھے، اس لیے وہ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ گھر مجھے ماں باپ کہتے تھے کہ مسلمان لڑکوں کے قریب نہ جایا کرو، ملیچھ (ناپاک) ہوتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو اچھوتوں سے زیادہ ناپاک سمجھ رکھا تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مسلمانوں کا مذہب کیا اور میرا مذہب کیا ہے۔۔۔۔۔

"میری عمر جب پندرہ سولہ سال ہوئی تو میں اپنے گھر میں گھٹن گھٹن سی محسوس کرنے لگا۔ یہ گھٹن ہر ہندو گھر میں ہوتی ہے۔ باپ دکانداری ور حساب کتاب کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ کھانے میں کنجوسی، سیر سپاٹے کی بات کرو تو کنجوسی۔ گھر سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ اسی لیے میں باہر رہتا تھا۔ تین چار سال بعد میں نے سگریٹ پینے شروع کر دیئے ور اُن لڑکوں کے ساتھ یارانہ گانٹھ لیا جو بدمعاشی بھی کرتے تھے۔ میں باپ کو ڈرا دھمکا کر پیسے اینٹھ لیا کرتا تھا۔۔۔۔۔

"تین چار سال بعد میں پکّے بدمعاشوں کی منڈلی میں چلا گیا اور وہاں شراب بھی مُنہ لگ گئی۔ ان بدمعاشوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ ہندو صرف دو تھے۔ وہ گائے کے گوشت کے کباب کھا لیا کرتے تھے۔ میں نے بھی یہ کباب کھائے اور میں پیٹ بھر کر کھایا کرتا تھا۔ میرے لیے

مذہب کوئی مطلب نہیں رکھتا تھا۔ مسلمان مجھے مذہب کی وجہ سے نہیں
بلکہ کھُلی کھُلی عادتوں اور کھُلے کھُلے دل کی وجہ سے اچھے لگتے تھے.....

"ایک رات میں گھر آیا تو گھر میں چار بڑی عمر کے ہندو میرے باپ کے
پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ انہیں میرے
باپ نے اس لیے بلایا تھا کہ سب مل کر مجھے شرمندہ کریں اور مجھے سیدھے
راستے پر لا کر دکان پر بٹھا دیں.....

"انہوں نے مجھے نصیحتیں کیں۔ میرا باپ کچھ بھی نہ بولا۔ اُس کے آنسو بہ
رہے تھے۔ سب نے یہ بات باری باری کہی کہ مسلمانوں والے کام چھوڑ دو۔
یہ تو میں نے بھی دیکھا کہ ایک سو بدمعاشوں میں نوّے مسلمان تھے۔ پکّے
بدمعاش یعنی جرائم پیشہ اور سزا یافتہ بھی سو میں نوّے مسلمان تھے۔ اُس زمانے
میں ایسے خطرناک ڈاکو اور رہزن تھے جن سے انگریزوں کی حکومت بھی ڈرتی
تھی۔ اُن میں بھی زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ پھر بھی مجھے مسلمان ہی اچھے
لگتے تھے.....

"ان چار ہندو لالوں نے میرے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت
پیدا کرنے کے لیے بہت ساری مثالیں دیں اور یہ بھی کہا کہ تم اِن ملیچھوں کے
ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہو جو تمہاری گئو ماتا کا گوشت کھاتے ہیں۔ میں نے انہیں
یہ نہیں بتایا کہ گئو ماتا کے کباب تو میں بھی کھایا کرتا ہوں جو بڑے مزیدار ہوتے
ہیں۔ میں سر جھکا کر اُن کی باتیں سُنتا رہا جو دوسرے کان سے نکل گئیں.....

"یہ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے یا ۱۹۲۶ء کا۔ میری عمر بائیس تیئیس سال ہو گئی
تھی۔ الٰہ آباد میں بسنتی نام کی ایک مشہور گانے والی تھی۔ جوان تھی اور خوبصورت
تو بہت ہی تھی۔ راجے مہاراجے اور نواب اُس کے مرید تھے۔ اس کے متعلق
مشہور تھا کہ صرف گاتی اور ناچتی ہے، اپنے جسم کو پاک رکھتی ہے۔ لوگ بتاتے
تھے کہ مہاراجوں اور نوابوں نے اُسے بے شمار دولت اور ہیرے اور تحفے
پیش کیے مگر اُس نے جواب دیا کہ میں اپنا جسم نہیں بیچتی، گانا اور رقص بیچتی ہوں۔

میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا.....

"ایک رات میرے دو بدمعاش دوستوں نے اور میں نے جوئے میں خوب
ہاتھ مارا اور دیسی شراب کی بجائے ولایتی وہسکی پی۔ نشے نشے میں ارادہ بن
گیا کہ بسنتی کا گانا سنیں گے۔ میں نے نشے میں کہا کہ گانا نہیں سنیں گے، آج
بسنتی کی قسم توڑیں گے۔ چاہے زبردستی کرنی پڑے۔ ہم تینوں بسنتی کے
گھر جا دھمکے۔ وہ اُس بازار میں دوسری منزل میں رہتی تھی۔ جو ہونا ہوتا ہے
اس کے لیے خدا سارے سبب پیدا کر دیتا ہے۔ اُس رات بسنتی کے ہاں
کوئی ایک بھی شوقین نہیں تھا۔ گانے والا کمرہ خالی تھا.....

"ہم اندر گئے تو دوسرے کمرے سے ایک بوڑھا سا آدمی آیا۔ اُس نے
کہا کہ بائی جی آرام کر رہی ہیں۔ ہم نے کہا کہ ذرا سامنے تو آ جائیں۔ دوسرے
کمرے سے ایک اور آدمی آ گیا۔ اُس نے بھی بڑی شرافت اور تمیز سے کہا
کہ بائی جی آرام کر رہی ہیں۔ ہم ضد کرنے لگے تو دوسرے کمرے سے بائی جی
آ گئیں۔ میں اُس کے حُسن کو بیان نہیں کر سکتا۔ قد درمیانہ اور جسم دُبلا تھا۔
اُس نے بڑی ہی سُریلی آواز میں کہا ——— 'آپ لوگ مجھے ایک رات آرام
بھی نہیں کرنے دیں گے'؟.....

"وہ اگر بنی ٹھنی ہوتی تو اتنی خوب صورت نہ ہوتی۔ اس قدرتی حالت
میں اُس نے ہمیں پاگل کر دیا۔ میرے ایک دوست نے صاف کہہ دیا
کہ ہم کس لیے آئے ہیں، اپنی قیمت بتاؤ.....

"اُس نے ہنس کر کہا ——— 'مجھے نواب بھی نہیں خرید سکے۔ تمہارے
پاس کیا ہو گا؟ تم اِدھر غلطی سے آ گئے ہو۔ جاؤ، سارا بازار کھلا ہے۔ کوئی
اپنی حیثیت کی دیکھ لو' ——— اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا ——— 'انہیں
باہر نکال دو'.....

"اُس کے دونوں آدمی ہماری طرف آئے۔ میرے ایک دوست نے
دروازے کی اندر سے زنجیر چڑھا دی۔ ہم تینوں نے چاقو نکال لیے۔

ایک ساتھی نے بسنتی سے کہا کہ شور کرو گی تو ماری جاؤ گی ۔ اُس کے دونوں آدمی بوڑھے تھے ۔ سازندے ہوں گے ۔ تین چاقو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئے ۔ بسنتی دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔ وہ دروازہ بند کر رہی تھی، لیکن میرے ساتھیوں نے مجھے کہا کہ تم اِن دونوں کو سنبھالو ۔ انہوں نے دَوڑ کر دروازے کو دھکا دیا اور اندر چلے گئے ۔ میں نے بسنتی کے دونوں آدمیوں کو چاقو کی نوک پر رکھ لیا ۔ وہ ایک کونے میں کھڑے ہو گئے اور میں چاقو اُن کی طرف کیے اُن کے سامنے کھڑا رہا.....

"دوسرے کمرے سے مجھے بسنتی کی گھٹی ہوئی آوازیں سنائی دیں، پھر خاموشی اور ذرا سی ہی دیر بعد میرے دونوں ساتھی اُس کمرے سے دوڑتے نکلے ۔ ایک نے کہا ۔۔۔۔۔ "منوہر بھاگو یہاں سے ۔ معاملہ خراب ہو گیا ہے" ۔۔۔ اور وہ دونوں دروازہ کھول کر دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اُتر گئے.....

"میں نہیں سمجھ سکا کہ اندر کیا ہو گیا تھا ۔ وہ پکّے بدمعاش تھے ۔ میں اناڑی تھا ۔ گھبرا کر وہیں کھڑا رہا ۔ نیچے مجھے شور سنائی دیا ۔ میں وہاں سے چل پڑا ۔ جونہی میں نے اُن دو آدمیوں کی طرف پیٹھ کی ۔ انہوں نے پیچھے سے مجھے ایسی مضبوطی سے جکڑ لیا کہ چاقو والا بازو بھی جکڑا گیا اور گردن بھی ۔ تین چار سیکنڈ میں بہت سے لوگ سیڑھیاں چڑھتے کمرے میں آ گئے ۔ دو تین آدمیوں نے ایک ہی بار کہا ۔۔۔۔۔ "بسنتی کو نیچے کس نے گرایا ہے؟" انہوں نے مجھے پکڑ لیا.....

"قصہ مختصر یہ کہ میرے ساتھیوں نے دوسرے کمرے میں جا کر بسنتی سے دست درازی کی تو اُس نے اُن سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے ۔ جب بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ رضا مند ہو گئی ۔ میرے ساتھی پیچھے ہٹ گئے ۔ کمرے کی ایک کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی ۔ بسنتی نے کہا کہ پردہ گرا دوں ۔ پردہ گرانے کے بہانے وہ کھڑکی تک گئی اور کھڑکی کھول

کر باہر کود گئی ۔ جس لڑکی نے مہاراجوں اور نوابوں کے تخت اور تاج ٹھکرا دیئے تھے وہ ہم جیسے بدمعاشوں کے ہاتھ آنے والی نہیں تھی ۔ بازار لوگوں سے بھرا ہوا تھا ۔ بسنتی کو بازار والے جانتے تھے ۔ وہ نازک بدن لڑکی دوسری منزل سے گرتے ہی مر گئی تھی ۔ لوگ دوڑتے اُوپر آ گئے ۔ مجھے چاقو سمیت پکڑ لیا گیا.....

"پولیس آ گئی ۔ اتنی مشہور اور اتنی خوبصورت گانے والی کی لاش بازار میں پڑی تھی ۔ مجھے تھانے لے گئے ۔ بسنتی کے آدمیوں نے کہا کہ اس کے ساتھ دو بدمعاش اور تھے ۔ میں نے کہا کہ میں اکیلا تھا ۔ بسنتی نے معلوم نہیں کیوں اُوپر سے چھلانگ لگا دی ۔ پولیس نے میرا جسم روئی کی طرح دُھننا شروع کر دیا.....

"رات اسی طرح گزر گئی ۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتائے....

"دوسرے دن تھانے میں لوگ جمع ہو گئے ۔ اِن میں بسنتی کے بڑے بڑے مالدار عاشق تھے ۔ بسنتی کی موت معمولی خبر نہیں تھی ۔ معلوم نہیں کہاں کہاں کے نواب بھی آ گئے ۔ وہ کہتے تھے کہ بسنتی کے قاتل کو چھوڑنا نہیں ۔ انہوں نے تھانیدار کو ضرور رشوت دی ہو گی ۔ میں نے ساری رات مار کھائی تھی ۔ ہوش گم تھے ۔ اسی حالت میں مجھے پھر اُس کمرے میں لے گئے اور کہا کہ اپنے ساتھی بتاؤ ۔ میں نے نہیں بتائے ۔ پولیس نے مجھے فرش پر لٹا کر ہاتھ پھیلا دیئے اور چارپائی اس طرح رکھی کہ اس کا ایک پایہ میرے ایک ہاتھ پر اور دوسرا دوسرے ہاتھ پر تھا ۔ چارپائی کے اس طرف چار آدمی بیٹھ گئے ۔ دو سپاہیوں نے میری ٹانگیں پھیلا کر پاؤں ایسے مروڑ کر دبا لیے کہ چیخیں نکل گئیں ۔ پوچھا کہ وہ دو کون تھے؟ میں نے کہا میں اکیلا تھا..

"انہوں نے لوہے کی سلاخ کا سرا گرم کر کے لال کیا اور میرے نازک اعضا پر رکھنے لگے ۔ سلاخ ساتھ نہیں لگائی لیکن تپش نے بے ہوش کر دیا ۔ میرے مُنہ پر پانی پھینکا ۔ پھر وہی سوال کیا ۔ میں نے پھر انکار کیا.....

"میرا سارا نشہ، ساری بدمعاشی اور عیش وعشرت ہرن ہو گئی۔ جسم ٹوٹ پھوٹ گیا۔ کئی مرتبہ بے ہوش ہوا لیکن ظالم چھوڑتے نہیں تھے۔ شام ہو گئی تو میرے دونوں ساتھی تھانے میں آ گئے۔ وہ دونوں مسلمان تھے۔ ایک نے دو مرتبہ جیل دیکھی تھی۔ دوسرا ابھی جیل نہیں گیا تھا۔ پکا بدمعاش تھا۔ انہوں نے تھانیدار سے کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ ہم اس کے ساتھ تھے...

"میری مصیبت ٹل گئی مگر میں بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ رات کو حوالات میں میں نے ان دونوں سے کہا کہ میں تمہارا نام نہیں بتا رہا تھا اور مار کھا رہا تھا۔ تم خود کیوں آ گئے؟ انہوں نے کہا کہ سپاہیوں کے ساتھ ہمارا یارانہ ہے۔ ایک سپاہی نے ہمیں بتایا تھا کہ تم ہماری خاطر ذبح ہو رہے ہو۔ اس لیے آ گئے۔ یہ ان کا کرم تھا۔ میں نے دوستی کی لاج رکھی تو انہوں نے بھی میری لاج رکھ لی مگر وہاں معاملہ سخت بگڑ گیا تھا.....

"میرے دوستوں نے اصل واقعہ پولیس کو بتا دیا لیکن موقعہ پر تو میں پکڑا گیا تھا۔ چاقو بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ بسنتی کے عاشقوں نے تھانیدار کا پیٹ روپوں سے بھر دیا تو اس نے ایسا مقدمہ بنایا کہ مجھے قاتل اور میرے دوستوں کو میرا حمایتی بنا دیا.....

"مقدمہ شروع ہوا تو سب گواہ جھوٹے گزرے۔ میں نے باپ کو پیغام بھیجا کہ میرے لیے کوئی قابل وکیل کر دو۔ اس نے جواب بھیجا۔ جس نے مجھے رسوا اور ذلیل کیا وہ میرا بیٹا نہیں۔ بھگوان تجھے جلدی پھانسی کے کنوئیں میں لٹکائے۔ میں تو تیری لاش بھی نہیں لوں گا۔ کہوں گا کوئی لاوارث بدمعاش ہے جسے میں نہیں جانتا.....

"میرے دوستوں نے جو وکیل کھڑا کیا تھا وہ دانا اور قابل نہ تھا۔ ہمارا کوئی گواہ بھی نہ تھا۔ بسنتی کی برادری کا اور پولیس کا جھوٹ۔ ایسا چلا کہ مجھے بسنتی کو چھت سے گرا کر قتل کرنے کے جرم میں عمر قید ملی اور میرے دونوں ساتھیوں کو پانچ پانچ سال.....

الہ آباد کا جیل خانہ بہت ہی ظالم تھا۔ سب افسر، داروغے اور سنتری قصائی تھے۔ اس زمانے میں چکی پسواتے اور بیلوں کی جگہ قیدیوں کو رہٹ کے ساتھ جوت دیتے تھے۔ سستی کرو تو ایسی مار دیتے تھے کہ چیخیں آسمان تک جاتی تھیں۔ میرے سارے گناہ مجھ سے بدلہ لینے لگے۔ دماغ پھر گیا۔ ماں باپ کا راجکمار بھنگی اور چمار بن گیا۔ کھانے کو دال کا نمکین پانی اور ڈنٹھل ملتے تھے.....

"میرا دل اس پر بہت کڑھتا تھا کہ جس گناہ کی مجھے سزا ملی تھی وہ میں نے نہیں کیا تھا۔ اگر یہ نیت کی سزا تھی تو نیت قتل کی نہیں تھی، مگر اتنی کڑی سزا نے سب کچھ بھلا دیا۔ تین مہینوں بعد یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں کون تھا اور کون ہوں۔ انیس سو ستائیس اٹھائیس کے جیل خانے آج کل کی طرح عشرت خانے نہیں تھے۔ آج کے قیدی باہر آتے ہیں تو ان کی صحت پہلے سے اچھی ہوتی ہے۔ وہ انگریزوں کے بندی خانے تھے جہاں کتے کی عزت تھی، انسان کو کتا سمجھتے تھے.....

"میرا وہ ساتھی جو دو مرتبہ جیل کاٹ چکا تھا، مجھے رات کو روزانہ کہا کرتا تھا کہ تھوڑا عرصہ شرافت اور برخورداری سے برداشت کرو، میں تمہیں جیل سے نکال دوں گا۔ میں حیران تھا وہ کیسے نکال دے گا؟ میں نے اس کے کہنے پر بہت شرافت سے وقت گزارا۔ فالتو کام کے لیے قیدیوں کو بلاتے تو میں دوڑ کر آگے ہو جاتا، اور اس طرح پورا ایک سال گزر گیا۔ میں انسان نہیں رہا۔ بیل اور گدھا بن گیا.....

"ایک ہیڈ وارڈر تھا۔ ان قیدیوں سے رشوت لیتا تھا جو چوری چکاری جیب تراشی میں بار بار جیل خانے میں آتے تھے۔ ان عادی قیدیوں کے ساتھی باہر ہیڈ وارڈر کو رشوت دیتے تھے اور وہ اندر ان قیدیوں کو آسان مشقت پہ یا صرف جھاڑو دینے پر لگاتا تھا۔ میرے دوست کا بھی اس کے ساتھ دوستانہ تھا۔ اس نے ایک روز اس وارڈر سے

میرے متعلق کہا کہ یہ شریف لڑکا ہے، بھول چوک سے پھنس گیا ہے۔ اسے باہر کی مشقت دے دو۔ میرے دوست نے اسے کاغذ کے چھوٹے سے ایک ٹکڑے پہ پانچ چھوٹی چھوٹی لکیریں ڈال دیں اور نیچے دھوبی کے نشان کی طرح ایک نشان ڈال دیا۔ اسے ایک جگہ اور ایک آدمی کا نام بتایا۔ یہ رشوت کا پیغام تھا۔۔۔۔۔

"تھوڑے سے قیدیوں کو کام کے لیے باہر بھی لے جاتے تھے۔ باہر سبزیوں کا باغ تھا۔ تین چار ایکڑ کھیت تھے۔ وہاں ہل کدال کے لیے قیدی صبح جاتے اور شام کو آتے تھے۔ باہر کام کرنے والوں کے دونوں ٹخنوں کے اوپر لوہے کے دو کڑے چڑھا دیتے تھے۔ دونوں کے ساتھ ایک ایک زنجیر، خاصی موٹی ہوتی تھی جن کے اوپر کے سرے ناف تک پہنچتے تھے۔ ان میں سے مضبوط رسّی گزار کر کمر کے گرد باندھ دیتے تھے۔ یہ بیڑیاں تھیں جو ہر وقت بندھی رہتی تھیں۔ ان سے قیدی بھاگ نہیں سکتا تھا۔ دوڑ تو سکتا تھا لیکن زنجیریں آپس میں ٹکرا کر آواز دیتی تھیں اور ٹانگوں سے لگ کر تکلیف دیتی تھیں۔۔۔۔۔

"ہیڈ وارڈر کو باہر سے رشوت مل گئی تو اس نے میری مشقت باہر کی کر دی۔ باہر جیل خانے کے سپرانٹنڈنٹ کے لیے نیا بنگلہ بن رہا تھا۔ راج باہر کے تھے، مزدوری قیدی کرتے تھے۔ مجھے کڑے بیڑی ڈال دی گئی اور میں اگلے روز قیدیوں کی پارٹی کے ساتھ باہر نکلا۔ سارا دن اینٹیں اٹھاتا اور اوپر چڑھاتا رہا اور سوچتا رہا کہ بھاگنے کی ترکیب کیا ہو۔ کچھ بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ رات کو میں جس بارک میں بند ہوتا تھا وہیں میرے دونوں دوست بند ہوتے تھے۔ وہ مجھ سے باہر کا حال احوال پوچھتے اور فرار کی ترکیبیں بتایا کرتے تھے لیکن قیدیوں کے لباس میں بیڑیوں کے ساتھ سنتری کی موجودگی میں بھاگنا ناممکن تھا۔۔۔۔۔

"پانچ چھ دنوں بعد مجھے ایک ترکیب نظر آئی۔ ایک راج صبح کام پر

آتا تھا تو پہنے ہوئے کپڑے اُتار کر کام کے لیے پھٹے پُرانے کپڑے پہن لیتا تھا۔ اچھے کپڑے ایک جگہ رکھ دیتا تھا، پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ قیدیوں کی ملاقات کے لیے جو لوگ آیا کرتے تھے وہ اس جگہ کے قریب سے گزرتے تھے جہاں بنگلہ بن رہا تھا۔ میں نے رات کو بارک میں اپنے دوستوں کو بتایا۔ انہوں نے مجھے ترکیب بتا دی اور کہا کہ تم نکل گئے تو کہیں رُکنا نہیں۔ الٰہ آباد سے بھی نکل جانا اور اس صوبے سے ہی نکل جانا۔ کہیں اپنے گھر نہ چلے جانا۔۔۔۔۔

"دوسرے دن میں ہر روز کی مانند قیدیوں کی پارٹی کے ساتھ جیل خانے کے باہر گیا اور بنگلے میں مزدوری شروع کر دی۔ راج نے اچھے کپڑے اُتار کر اُسی جگہ رکھ دیئے جہاں روزانہ رکھتا تھا۔ یہ ایک کمرہ تھا جو مکمل ہو چکا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب کام شروع ہوا تو سنتری پرے جا کر بیٹھ گیا۔ ملاقاتی واپس جا رہے تھے۔ میں نے اپنے دوست کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق دوسرے کمرے میں جا کر بہت ہی تیزی سے جیل خانے کا پاجامہ کُرتہ اُتار کر پھینک دیا اور راج کے کپڑے پہن لیے۔ یہ ایک گرم کپڑے کا کھُلا پاجامہ تھا۔ اسی کپڑے کا کُرتہ تھا اور ایک کمبل تھا۔ بیڑیوں کی زنجیروں کا یہ انتظام کیا کہ ایک رسّی جو کمر کے گرد تھی وہ کھول لی اور اپنے اُتارے ہوئے پاجامے کا آزاربند کھول لیا۔ دائیں ٹانگ والی زنجیر دائیں پنڈلی کے گرد اور بائیں والی بائیں پنڈلی کے گرد کس کر لپیٹ دی۔ ایک کے اُوپر رسّی باندھ دی اور دوسری پر آزاربند۔ ان کے اوپر کھُلا اور لمبا پاجامہ تھا۔ کڑے اور زنجیریں چھپ گئیں۔۔۔۔۔

"راج اور قیدی دُوسری طرف کام میں لگے ہوئے تھے۔ میں اپنے اُوپر کمبل ڈال کر اور منہ سر چھپا کر وہاں سے نکلا اور ملاقاتیوں میں شامل ہو گیا۔ دل بہت زور زور سے اچھل رہا تھا۔ میں نے پیچھے نہیں دیکھا۔ ملاقاتیوں کے ساتھ دور نکل گیا۔ وہاں سے گھوم کر دیکھا۔ راج اور قیدی کام میں

لگے ہوئے تھے اور سنتری ڈنڈا ہاتھ میں اُچھال رہا تھا .....

"میں بہت ہی تیز چلتا شہر کے اُس محلے میں پہنچ گیا جہاں میرے جوئے باز دوستوں اور بدمعاشوں کا اڈہ تھا ۔ میری ضرورتیں اب یہ تھیں کہ بیڑی کے کڑے کٹ جائیں اور زنجیریں کہیں پھینک دوں اور اتنے پیسے مل جائیں کہ کسی بہت ہی دُور جگہ کا ٹکٹ لے کر گاڑی پر سوار ہو جاؤں ۔ کڑے اتارنے مشکل نہیں تھے ۔ ان میں ایک ایک موٹا کیل ڈال کر اوران کے سرے ہتھوڑوں سے چوڑے کر کے کڑوں کے ساتھ برابر کر دیئے گئے تھے ۔ آپ نے ریلوٹ دیکھے ہوں گے ۔ ایک چھینی اور ایک ہتھوڑے کی ضرورت تھی مگر یہ کام ہر لوہار نہیں کر سکتا تھا ۔ کڑے اور بیڑیاں صرف قیدیوں کو ڈالی جاتی ہیں .....

"میں اڈے پر گیا ، وہاں کوئی نہ ملا ۔ اپنے چار دوستوں کے گھر گیا ، کوئی ایک بھی گھر نہ ملا ۔ باقی دن چھُپ چھُپ کر گزارا ۔ رات کو پھر اڈے پر گیا ۔ وہاں ایک دوست مل گیا ۔ وہ ہندو تھا ۔ میں نے اُسے بہت رقم کھلائی تھی ۔ اُسے اشارے سے باہر بُلایا ۔ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا ۔ میں نے اُسے بتایا کہ جیل خانے سے بھاگ آیا ہوں ۔ رقم کا بندوبست کرو تاکہ میں رات کی گاڑی سے نکل جاؤں ۔ اس نے میرے اُن دو مسلمان دوستوں کے متعلق جو میرے ساتھ قید ہوئے تھے پوچھا ۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ جیل خانے میں ہیں .....

"میرا یہ ہندو دوست سوچ میں پڑ گیا ، پھر بولا ۔ 'آؤ میرے ساتھ۔' مجھے اس پر بھروسہ تھا ۔ وہ مجھے ساتھ لے گیا ۔ بہت دُور جا کر اُس نے مجھے ایک جگہ روک کر کہا کہ یہیں انتظار کرو ۔ میں رُک گیا ۔ وہ کہیں چلا گیا ۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ مجھے آتا نظر آیا لیکن اکیلا نہیں تھا ۔ وہاں دو بتیوں کی روشنی تھی ۔ میں نے پچاس ساٹھ قدم دُور سے ہی اس کے ساتھ والے

آدمی کو پہچان لیا ۔ وہ پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل تھا ۔ وردی میں نہیں تھا ۔ اس نے پاجامہ کرتہ اور سویٹر پہن رکھا تھا ۔ اُسے میں بہت اچھی طرح جانتا تھا ۔ سڑک کے پار دیکھا ، وہاں بھی دو آدمی آرہے تھے ۔ ان میں سے میں نے ایک کو پہچانا ۔ تھانے کا سپاہی تھا ۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ میرا دوست دھوکہ دے گیا ہے ۔ تب میں نے دیکھا کہ جہاں میں کھڑا تھا وہ جگہ تھانے کے پچھواڑے میں تھی .....

"میں نے چوکڑی بھری اور پیچھے کو دوڑ پڑا ۔ رات زیادہ نہیں ہوئی تھی ۔ کچھ لوگ ابھی سڑک پر گھوم پھر رہے تھے ۔ اُس زمانے میں شہروں کی آبادیاں آج کی طرح بھِڑوں کے چھتّے کی مانند نہیں تھیں ۔ مجھے پیچھے سے آوازیں سُنائی دیں ــــ 'پکڑ لو اسے ۔ کمبل والے کو پکڑ لینا' ــــ خطرے میں انسان کی رفتار تیز ہو جاتی ہے ۔ میں بہت تیزی سے دوڑا ۔ میرا اپنا شہر تھا جس کی ہر ایک گلی سے مجھے واقفیت تھی .....

"ایک اندھیری گلی میں جا کر میں ایک مکان کے تھڑے کے نیچے چھپ گیا ۔ نیچے گندی نالی بہتی تھی ۔ وہ لوگ اسی طرف آئے اور دوڑتے ہوئے آگے چلے گئے ۔ میں بہت دیر چھپا رہا ۔ میں چور اور ڈاکو نہیں تھا ۔ مجھ میں کوئی اُستادی نہیں تھی ۔ میں ڈرنے لگا ، پھر میں وہاں سے نکلا ۔ میں اتنا تو سمجھ سکتا تھا کہ اس وقت تک جیل خانے والوں نے پولیس کو اطلاع دے دی ہو گی کہ منوہر نامی عمر قیدی بھاگ گیا ہے ۔ پولیس چوکس ہو چکی ہو گی ..

"مجھے پیسوں کی ضرورت تھی ۔ ارادہ کیا کہ اپنے گھر جاؤں اور باپ کو ڈرا دھمکا کر بہت سی رقم لے کر نکل جاؤں ، لیکن عقل نے کام کیا ۔ میں اس ڈر سے وہاں نہیں گیا کہ پولیس میرے گھر ضرور جائے گی اور گھر کی تلاشی بھی لے گی ۔ میرے باپ کی دکان دُور نہیں تھی ۔ وہ دُکان دیر سے بند کیا کرتا تھا ۔ میں تھڑے کے نیچے سے نکل کر اُدھر کو چل پڑا ۔ ہر قدم پر ڈر لگتا تھا ۔ میں اندھیرے راستوں سے بازار میں داخل ہوا ۔ دکانیں بند

ہو رہی تھیں۔ میری بیڑیوں کی بالکل آواز نہیں آتی تھی۔ میں بازار میں مُنہ کمبل میں چھپائے سیدھا چلتا گیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ موسم سردیوں کا تھا اس لیے کسی کو اس پر شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں نے مُنہ اور سر کمبل میں کیوں چھپایا ہوا ہے.....

"اچانک ایک بغلی گلی سے دو پولیس کانسٹیبل نکلے۔ وہ بہت تیز چل رہے تھے۔ میرا خون خشک ہو گیا لیکن میں بھاگا نہیں۔ وہ میری طرف گھومے اور مجھے دیکھتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے۔ آگے کا سارا بازار بند ہو چکا تھا۔ یہ بڑے تاجروں اور تھوک کے بیوپاریوں کی دکانیں تھیں۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ میرے باپ کی تھوک کی دکان بھی اندھیری ہو چکی تھی۔ قریب گیا تو دیکھا کہ میرا باپ دکان کو تالے لگا رہا تھا....

"میں اُس کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا اور آہستہ سے کہا ——
'پتاجی! میں منوہر ہوں۔ جیل خانے سے بھاگ آیا ہوں۔ آپ نے مجھے بچایا نہیں۔ مجھے تین چار سو روپیہ دے دیں۔ میں الہ آباد سے نکل جاؤں گا پھر آپ کو پریشان کرنے کبھی نہیں آؤں گا.....'

"اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ اُس نے آواز سے مجھے ضرور پہچان لیا ہوگا۔ اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا۔ دُور کی بتی کی ذرا سی روشنی میں مجھے صاف نظر آیا کہ حیرت اور خوف سے اُس کی آنکھیں دُگنی کھل گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا۔ اچانک پیچھے کو مڑا اور اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے —— 'بھ..... بھوت..... چ..... چور' —— اور وہ بہت ہی تیز دوڑ پڑا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے حد ڈرپوک ہے۔ اُس کے پیچھے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دکان کو دیکھا۔ وہ بڑے بڑے دو تالے چڑھا کر چابیاں ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے وہاں سے کھسکنے کی کی...

"اب میرے لیے کوئی پناہ نہیں تھی۔ تھوڑے سے پیسے ہوتے تو کسی لوہار کو دے کر بیڑیوں کے کڑے تڑوا لیتا۔ پولیس کو میرا ایک بدمعاش

دوست یہ تو بتا چکا تھا کہ مفرور قیدی شہر میں ہے۔ جیل خانے سے بھی اطلاع آ چکی ہو گی۔ میں شہر سے نکلنے کے لیے اندھیرے راستوں پر ہو لیا۔ سڑک کے راستے نہیں گیا۔ ایک طرف ویرانہ تھا اور اُس سے تھوڑا ہی آگے دریا تھا۔ میں اُس طرف گیا۔ آبادی کے آخری مکان سے ذرا آگے گیا، تو اندھیرے میں دو آدمیوں کی باتیں سنائی دیں۔ وہ آہستہ آہستہ میرا راستہ کاٹ رہے تھے۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ آگے چلے گئے۔ میں اُن سے ہٹ کر آگے گیا۔ میں نے پاؤں کی آہٹ دبانے کی نہیں سوچی تھی.....

"انہوں نے میری آہٹ سُن لی اور ایک نے آواز دی۔ 'ٹھہر جا' کون ہے؟ ادھر آ' —— یہ آواز پولیس کے سپاہی کی لگتی تھی۔ میں دوڑ پڑا۔ ایک نے بلند آواز سے کہا —— 'یہی ہو گا پکڑو' —— میری رفتار اور تیز ہو گئی۔ وہ امن کا زمانہ تھا۔ جرائم اتنے زیادہ نہیں تھے جتنے آج کل ہیں۔ گنتی کے جرائم پیشہ لوگ ہوتے تھے۔ پولیس فوراً پکڑ لیتی تھی۔ انگریزوں کی حکومت تھی۔ پولیس سُستی نہیں کرتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ شہر کی ناکہ بندی ہو چکی ہے، ورنہ اس طرح کوئی کسی راہ گیر کو نہیں روکتا تھا.....

"مجھے ڈر تھا کہ ان کے پاس رائفلیں ہوں گی اور وہ مجھ پر گولی چلائیں گے لیکن گولی نہ چلی۔ وہ میرے پیچھے دوڑے آ رہے تھے۔ میں نے فاصلہ کم نہیں ہونے دیا۔ بہت دیر دوڑنے کے بعد آگے دریا آ گیا۔ میں نے کچھ بھی نہیں سوچا، سیدھا دریا میں گیا۔ سردیوں کی رات میں دریا کا پانی برف ہو گیا تھا۔ میں نے کمبل اتار پھینکا۔ پہلے پانی گھٹنوں تک آیا پھر کمر تک اور پھر پاؤں اُٹھ گئے۔ اگر موسم گرمیوں کا ہوتا تو دریا سیلابی ہوتا۔ سردیوں میں سیلاب تو نہیں تھا، پانی کی رفتار سست تھی مگر پانی بہت ہی یخ تھا.....

"میں تیرنے لگا اور جسم اکڑنے لگا۔ دریا اتنا چوڑا تو نہیں تھا مگر ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ڈر یہ لگا کہ میں اکڑ کر مر جاؤں گا۔ آخر پاؤں ریت سے لگے اور میں ہاتھوں سے پانی ہٹاتا پار چلا گیا۔ اندھیرا گہرا تھا۔ رُک کر کان کھڑے

دریا میں کسی کے تیرنے کی آواز نہیں تھی۔ میں ناک کی سیدھ دوڑ پڑا۔ وہاں سے دریا کا پُل تقریباً ایک میل دُور تھا۔ میں نے سوچا کہ جتنی دیر میں پل سے پولیس آتی ہے میں دُور نکل جاؤں گا۔ گیلے کپڑے، سرد ہوا اور اکڑا ہوا جسم دوڑنے نہیں دیتا تھا۔ میں کوشش کر کے دوڑتا گیا اور ایک گاؤں آگیا.....

"میں نے پہلے ہی گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا کہ ہندو ہے۔ بڑی عمر کا آدمی تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں دریا کے کنارے جا رہا تھا۔ ڈاکوؤں نے روک کر ساڑھے تین سو روپیہ چھین لیا اور مجھے دریا میں پھینک دیا۔ میں ان کپڑوں میں مر جاؤں گا۔ مجھے کپڑے دیں۔ کل صبح واپس کر جاؤں گا.....

"وہ مجھے اندر لے گیا۔ ایک کمرے میں لے جا کر خشک کپڑے لے آیا۔ یہ بھی گرم کپڑے کا پاجامہ اور کُرتہ تھا۔ ساتھ گرم واسکٹ تھی اور ایک کھیس بھی تھا۔ میں گیلے کپڑوں میں مر رہا تھا۔ بالکل احتیاط نہ کی۔ کھیس کندھوں پر ڈال کر گیلا پاجامہ اتارا اور خشک پہنا، پھر گیلا کُرتہ بدلا۔ اوپر واسکٹ پہنی اور کھیس اوڑھ لیا۔ میرے دانت بج رہے تھے.....

"گیلے کپڑے کونے میں پھینک کر میں کھاٹ پر بیٹھا تو اس آدمی نے آگے آ کر میرا پاجامہ اُوپر سرکایا۔ بیڑیوں کی زنجیر اور کڑے ننگے ہو گئے۔ یہ اُس نے اُس وقت دیکھا تھا جب میں نے اُس کی طرف پیٹھ کر کے کھیس کندھوں پر ڈالا اور پاجامہ بدلا تھا۔ میری پنڈلیاں ننگی ہو گئی تھیں.....

"اُس نے پوچھا — 'قید خانے سے بھاگے ہو؟' — میرا جواب سُنے بغیر بولا — 'کب بھاگے ہو؟' — میں اس کی نیت نہیں سمجھ سکا۔ میری دماغی حالت بہت بُری تھی۔ میں نے بتا دیا کہ آج ہی

قید خانے سے بھاگا ہوں۔ یہ بھی کہا کہ میں بے گناہ عمر قید بھگت رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ 'فوراً یہاں سے نکل جاؤ' — میں نے کہا کہ میری بیڑیاں کٹوا دو اور کھانے کے لیے کچھ دے دو۔ اس نے کہا کہ میرے گھر میں ملیچھوں اور پاپیوں کے لیے کھانا نہیں ہے۔ فوراً نکلو ورنہ میں دونوں بیٹوں کو جگا کر تمہیں باندھ لوں گا اور پولیس کے حوالے کر دوں گا.....

"مجھے غصہ آگیا جو وہاں بیکار تھا۔ میں نے پوچھا کہ تمہارے کپڑے اتار دوں؟ اُس نے جواب دیا۔ 'اتار دو گے تو بھی میں یہ کپڑے نہیں رکھوں گا۔ کسی چُوہڑے چمار کو دے دوں گا'.....

"وہاں سے میں نکلا۔ مجھے فائدہ یہ ہُوا کہ خشک کپڑے مل گئے۔ میں نے گاؤں میں کسی اور گھر میں قسمت آزمانے کی جرأت نہیں کی۔ گاؤں سے نکل کر فوراً دماغ میں یہ خیال آیا کہ اگر میرے پیچھے دوڑنے والے پولیس کے آدمی تھے تو دریا کے اس طرف ضرور آئیں گے۔ لہٰذا مجھے بہت جلدی دُور نکل جانا چاہیئے.....

"میں دریا سے دُور ہٹنے لگا اور سوچنے لگا کہ میری فوری ضرورتیں یہ ہیں کہ بیڑیاں کٹ جائیں، رات کے لیے کہیں سردی سے پناہ مل جائے اور روٹی مل جائے۔ بھُوک نے سردی کے ساتھ مل کر جسم کی طاقت چوس لی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے میں نے یہ بھی سوچا کہ میں جا کہاں رہا ہوں؟ کس طرف جا رہا ہوں؟ اس سوچ نے دماغ خراب کر دیا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی۔ سردی میں تھر تھر کانپتا چلا گیا اور جسم گرم کرنے کے لیے میں دوڑنے لگا مگر زیادہ نہیں دوڑ سکا۔ کوئی جگہ دُور تک میدانی تھی اور کوئی جگہ اونچی نیچی۔ ایک بار میں گرا بھی۔ فوراً اُٹھا اور تیز چلنے لگا.....

"اب ایک مشکل اور سامنے آگئی۔ میں سگریٹ نوش تھا۔ جیل خانے میں دوستوں سے دو چار کش مل جاتے تھے۔ اب وہ بھی نہیں تھے۔

نشے سے ٹوٹ کر آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ مجھ میں تو پہلے ہی دم نہیں تھا، سگریٹ کی طلب نے بالکل ہی دم نکال دیا۔ سر ڈول رہا تھا اور پاؤں اُکھڑ رہے تھے.....

" معلوم نہیں میں دو میل چلا، تین میل چلا، کتنا چلا۔ مجھے دُور سے الاؤ نظر آیا۔ خاصی زیادہ آگ تھی۔ میں تیز چلنے لگا۔ الاؤ دُور ہٹتا گیا۔ بہت ہی دیر بعد میں اس تک پہنچ گیا اور اس کے پاس جا گرا۔ دو آدمی میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ زبان بول نہیں سکتی تھی۔ آگ نے گرمی دی تو میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کون ہیں.....

" وہ دونوں ڈُوم تھے اور ایک مُردے کو جلا رہے تھے۔ یہ مرگھٹ تھا۔ اس کے قریب ایک گاؤں تھا۔ کوئی ہندو مر گیا تھا۔ شام کو اُس کی ارتھی کو آگ لگائی گئی تھی جو ابھی تک جل رہی تھی۔ مُردے جلانا ڈُوموں کا کام ہوتا ہے۔ اُن کے پاس حُقّہ تھا۔ میں نے اُن سے حقّہ چھین کر کش پہ کش لگانے شروع کر دیئے۔ تھکے ہوئے جسم اور خالی پیٹ کے اندر دُھواں گیا تو دماغ چکرا گیا۔ چکرائے ہوئے دماغ نے ایک بات سوچ لی....

" میں نے ڈُوموں کو اپنا پاجامہ اُوپر اُٹھا کر بیڑیاں دکھائیں اور کہا کہ میں جیل میں چھ سنتریوں کو قتل کر کے بھاگا ہوں۔ میں بنارس کا ڈاکو ہوں۔ تم میرے دو کام کر دو۔ ایک چھینی اور ہتھوڑی لے آؤ۔ کچھ کھانے کے لیے لاؤ اور کسی کو پتہ نہ چلنے دینا۔ کل شام مجھے اسی جگہ ملنا۔ نقد روپوں کی تھیلی دُوں گا اور دونوں کو تین تین تولے سونا دُوں گا۔ اگر دھوکہ دو گے تو میرے ساتھی تم دونوں کو تمہارے بچوں سمیت قتل کر دیں گے اور تمہارے گھروں کو آگ لگا دیں گے۔ جاؤ اور جلدی آؤ.....

" اُن میں سے ایک چلا گیا۔ اُس دور میں ڈاکو مشہور تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ یہ دونوں ڈر جائیں گے۔ وہ ڈوم بہت دیر کر کے آیا۔ میں وہ آگ تاپتا رہا جس میں ایک ہندو کی لاش جل رہی تھی۔ ڈوم آیا تو اس کے ایک

ہاتھ میں ایک ہتھوڑی اور چھینی تھی اور دوسرے ہاتھ میں روٹیاں۔ روٹیوں پر سبزی کی بھُجیا تھی۔ میں نے اسے کہا کہ چھینی اس کڑے کے جوڑ پر رکھ کر زور سے ہتھوڑی مارو۔ اُس نے کہا، اُستاد پہلے روٹی کھا لو۔ میں بُری طرح بھوکا تھا۔ تیزی سے روٹیوں کے بڑے بڑے نوالے منہ میں ٹھونسنے اور نگلنے لگا.....

" دو روٹیاں حلق سے اُتر گئیں تو میں نے سامنے دیکھا۔ الاؤ کی پیلی سی روشنی میں مجھے بیس بائیس قدم دور ایک درخت کے پیچھے کوئی چھپا ہوا نظر آیا۔ ذرا پرے ایک سایہ سا چلتا دکھائی دیا۔ میں نے باقی روٹی زمین پر رکھ دی اور نظریں درختوں میں جما دیں۔ آگ اور دو روٹیوں نے میرے جسم کی طاقت جگا دی تھی۔ مجھے شک ہوا کہ ڈوم گاؤں کے آدمی ساتھ لایا ہے.....

" ایک ڈوم نے بیٹھے بیٹھے مجھ پر چھلانگ لگائی اور میرے اُوپر آ پڑا۔ وہ کمزور سا آدمی تھا۔ میں جوش سے اُٹھا اور اُس ڈوم کو جھٹک کر پھینکا تو وہ جلتی ہوئی ارتھی کے اوپر جا پڑا۔ اُس کی چیخ نے میرا کلیجہ چیر دیا۔ میں پیچھے کو دوڑ پڑا۔ آوازیں آنے لگیں ـــــ "آگے سے روکو، ہری آگے ہو کر" ـــــ وہ ایک دوسرے کا نام لے لے کر مجھے گھیرنے کے لیے دوڑ رہے تھے۔ میں نے دوڑتے ہوئے بلند آواز سے کہا ـــــ "میرے پاس پستول ہے۔ جو سامنے آئے گا اُڑ جائے گا" ـــــ شاید اس للکار سے وہ ڈر گئے۔ شور تو کرتے رہے لیکن میں نکل گیا.....

" میرے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ نہیں تھی۔ میں رُکا نہیں، دوڑتا ہی گیا۔ کہیں جھاڑیوں میں پھنس کر گرا، کہیں کھڈ میں گرا، پھر بھی رُکا نہیں۔ آخر ٹانگیں جواب دینے لگیں اور میں رُکتے رُکتے ایک درخت سے ٹکرا کر گر پڑا، پھر نہیں اُٹھا گیا۔ یہ بہت بوڑھا پیپل کا درخت تھا۔ تنے میں کھوہ سی تھی۔ اس میں سُکڑ گیا۔ کھیس اچھی طرح لپیٹ لیا اور بے خبر سو گیا.....

"آنکھ کھلی تو سورج سر پر آ کر آگے نکل گیا تھا۔ جسم اور دماغ ٹھکانے آ گئے تھے۔ اُٹھ کر دیکھا۔ ہر سُو جنگل بیابان تھا۔ کہیں کوئی آبادی نظر نہ آئی۔ میں اُسی رُخ چل پڑا جس رُخ رات کو دوڑا تھا۔ جنگل کے پیڑ پودوں کے ساتھ جو کچھ لگا ہوا تھا توڑ توڑ کر کھاتا اور چلتا رہا۔ شام سے ذرا پہلے ایک گاؤں نظر آیا لیکن میں اُس سے دُور رہا۔ دل پر اب اتنا ڈر بیٹھ گیا تھا کہ درخت سے کوئی پرندہ اُڑتا تھا تو میں بدک جاتا تھا کہ سپاہی آ گئے ہیں......

"سورج غروب ہونے کے بعد بھی میں چلتا رہا۔ شاید آدھی رات کا وقت تھا جب ایک چٹان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور آنکھ لگ گئی۔ دوسرے دن دوپہر سے ذرا پہلے آنکھ کھلی تو مجھے رونا آ گیا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے بچّوں کی طرح رونا شروع کر دیا اور بہت دیر تک روتا ہی رہا۔ میں نے ہمّت چھوڑ دی تھی۔ میں کہاں کا شیر بہادر تھا۔ میں شرابی، جواری اور باپ کے چُرائے ہوئے پیسوں کا بگڑا ہوا بدمعاش تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر خدا سے، بھگوان سے، اللہ سے اور پرماتما سے گناہوں کی معافی مانگی، کان پکڑے، زمین پر ناک رگڑی مگر نہ مسلمانوں کے اللہ نے سُنی نہ ہندوؤں کے بھگوان اور پرماتما نے۔ میں روتے روتے چل پڑا۔ دو ندیوں میں سے گزرا۔ پیٹ بھر کر پانی پیا۔ کہیں بیٹھا۔ کچھ چلا اور سورج غروب ہو گیا۔ میں چلتا رہا......

"دُور سے روشنیاں نظر آئیں۔ میں نے اُدھر کا رُخ کر لیا۔ یہ ارادہ کیا کہ کسی سے پناہ اور روٹی مانگوں گا۔ یہ کوئی قصبہ تھا یا بڑا گاؤں۔ میں نے گاؤں میں داخل ہو کر ایک بڑا گھر دیکھ کر اُس کے دروازے پر ہاتھ مارے......

"ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ اُس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ راستے میں ٹھگوں نے لوٹ لیا ہے۔ رات گزارنی ہے۔

صبح چلا جاؤں گا۔ وہ بھی ہندو تھا۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان نہیں ہندو ہوں......

"اُس نے ذرا غصّے سے کہا —— 'یہ سرائے نہیں مہاراج! آشرم میں چلے جاؤ' —— میں نے پوچھا آشرم کدھر ہے —— اُس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا —— 'اسی گلی میں آگے چلے جاؤ'.....

"میں سخت مایوس ہو کر آگے چلا گیا۔ آشرم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے باہر سے پہچان لیا۔ یہ دراصل مندر تھا۔ دروازے کو ہاتھ لگایا تو کھل گیا۔ میں اندر گیا۔ صحن تھا۔ اس کے آگے کمرہ جس میں روشنی تھی۔ اُس میں مجھے سامنے دیوار کے ساتھ بھگوان کا بُت نظر آیا۔ دائیں ہاتھ برآمدہ جس میں چار پانچ آدمی فرش پر سوئے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے قریب لیٹ گیا اور سو گیا.....

"کسی نے ٹھوکریں مار کر جگایا۔ میں گھبرا کر اُٹھا۔ دن چڑھ گیا تھا۔ یہ ایک پنڈت تھا۔ ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔ کون ہو؟ کدھر سے آئے ہو؟ یہاں کب آتے ہو؟ کیوں آئے ہو؟.....

"میں نے کہا کہ الٰہ آباد کا دکاندار ہوں۔ دیہات میں وصولی کے لیے گیا تھا۔ دو ہزار روپیہ ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ رات یہاں گزاری ہے اب جا رہا ہوں.....

"میرے پاجامے کا ایک پائنچہ اُوپر اُٹھ گیا۔ پنڈت نے کڑے اور زنجیر دیکھ لی۔ اُس نے ہڑبڑا کر کہا —— 'قیدی' تو خود ڈاکو ہے —— اُس نے کسی کو آواز دی۔ بہت سے لوگ مندر میں عبادت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ پنڈت اُدھر دوڑا اور کہہ گیا۔ 'میں تجھے پولیس کے حوالے کراتا ہوں' —— اُس کے جاتے ہی میں ہرن کی طرح چھلانگیں لگاتا مندر سے نکل گیا اور پھر گاؤں سے بھی نکل گیا۔ قریب ہی اُترائی تھی اور آگے کھڈ نالے اور جنگل۔ میں ان میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دُور

تک دوڑتا گیا، پھر چلنے لگا .....

"اب تو مایوسی نے مجھے دبالیا اور میں خودکشی کا ارادہ کرنے لگا۔ بھوک اور تھکان نے مار ڈالا تھا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے میرے پیچھے آوازیں آرہی ہیں ——— 'ملیچھ ہے، اچھوت ہے۔ اسے گھر میں نہ گھسنے دینا' ......

"وہ دن بھی چلتے، گرتے، بیٹھتے اور روتے گزر گیا۔ رات کو بھی چلتا رہا۔ جہاں تھک کر گر پڑا وہیں سو گیا۔ دن کو آنکھ کھلی تو پھر چل پڑا۔ گاؤں نظر آئے لیکن میں ان میں نہیں گیا، پھر رات آگئی۔ پھر آج مجھے یاد نہیں رہا کہ ایک اور دن اور رات سفر میں گزری تھی یا نہیں۔ یہ یاد ہے کہ رات کے پہلے پہر روشنیاں نظر آئیں۔ میں نے خودکشی کا ارادہ بدل دیا تھا۔ مرنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں ان روشنیوں کی طرف اس ارادے سے چل پڑا کہ پہلے ہی گھر پہ دستک دوں گا اور کہوں گا کہ مجھے روٹی دو، مجھے پانی پلاؤ اور میرے اوپر لحاف ڈال دو، میں جیل خانے سے بھاگا ہوا قیدی ہوں، پولیس کو اطلاع دو کہ مجھے اُٹھا کر لے جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں پکڑا جاؤں گا تو جیل میں مجھے ظالموں کی طرح سزا دیں گے اور مجھے کالا پانی بھیج دیں گے۔ مجھے منظور تھا۔ میں اب اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا ......

"میں پاؤں گھسیٹتا گاؤں میں داخل ہوا۔ یہ بھی گاؤں تھا۔ ایک بند دروازے پر ہاتھ مارے اور میں بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھلا۔ اس آدمی نے پوچھا کون ہو؟ میں نے کہا ہندو ہوں۔ مجھے اندر لے چلو، پانی پلا دو، پھر بتاؤں گا میں کون ہوں پھر جو سلوک من میں آئے کرنا ....

"وہ اندر لے گیا۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ مسجد تھی۔ صحن تھا۔ اس سے آگے برآمدہ۔ آگے لمبا کمرہ۔ اندھیرے میں مینار صاف نظر آرہے تھے۔ یہ آدمی صحن میں لے جانے کی بجائے مجھے دائیں طرف لے

گیا اور ایک کمرہ آگیا۔ میں اس کے پیچھے اندر گیا۔ اُس کا چُغہ، داڑھی اور ٹوپی دیکھ کر میں نے جان لیا کہ مسجد کا امام ہے۔ اُس نے فرش پر بچھی ہوئی دری پہ بٹھایا۔ باہر جا کر مٹی کا لوٹا اُٹھا لایا اور مجھے دیا ....

"میں نے پانی پی کر لوٹا رکھ دیا اور پاجامہ دونوں ٹانگوں سے اٹھا کر اُسے بیڑیاں دکھائیں۔ میں نے بتایا کہ الٰہ آباد کے قید خانے سے بھاگا ہوں۔ اُس نے پوچھا جُرم کیا تھا۔ میں نے اپنے بچپن سے بات شروع کی اور مسجد تک پہنچنے تک ذرا ذرا سی باتیں بھی سُنا دیں۔ میں نے روتے روتے بات سنائی اور کہا کہ میں گناہگار ہوں لیکن اپنے مندر میں بھی مجھے پناہ نہیں ملی۔ میں نے وہ گناہ نہیں کیا جس کی مجھے سزا ملی ہے ...

"مولوی صاحب اُٹھے اور کچھ کہے بغیر باہر نکلے۔ دروازہ بند کر کے باہر کی زنجیر چڑھا دی اور چلے گئے۔ مجھے یہ رنج تو ہوا کہ مسلمانوں کے مولوی نے بھی پناہ نہیں دی۔ اُلٹا مجھے قید کر کے پولیس کو بلانے چلا گیا ہے لیکن مجھے اطمینان ہوا کہ پولیس مجھے لے جائے گی اور میرا یہ کٹھن سفر جس کی کوئی منزل ہی نہیں ختم ہو جائے گا .....

"بہت دیر بعد دروازہ کھلا۔ میں گرفتاری کے لیے تیار ہو گیا۔ مولوی صاحب نے روٹیاں اور ایک پلیٹ میں سالن میرے آگے رکھ کر کہا۔ 'اگر مسلمان کی روٹی قبول کرتے ہو تو یہ کھا لو' ——— وہ دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے اور میں حیران ہو کر اُن کا مُنہ دیکھنے لگا۔ انہوں نے کہا میں جانتا تھا کہ ہندو بھوکا مر جائے گا مسلمان کی روٹی نہیں کھائے گا۔ تم بھی نہیں کھا رہے..

"میں نے خاموشی سے روٹی کھانی شروع کر دی۔ مولوی صاحب کا گھر مسجد سے تھوڑا دُور تھا۔ اس کمرے میں پڑھنے کے لیے بیٹھتے تھے۔ میں نے کھانا کھا لیا، پانی پی لیا تو انہوں نے کہا کہ تم یہیں سو جانا، میں باہر سے تالا لگا جاؤں گا۔ صبح منہ اندھیرے آؤں گا .....

"میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ آپ مجھے پولیس کے حوالے کب کریں گے؟

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور رو کر پوچھا کہ وہ میرا کیا کریں گے ؟ انہوں نے کہا ـــــ "یہ گھر میرا نہیں ، یہ خدا کا گھر ہے ۔ تم نے مجھ سے نہیں خدا سے پناہ مانگی ہے ۔ تم بتاؤ چاہتے کیا ہو ؟" ......

"میں نے کہا کہ میری بیڑیاں کھل جائیں ۔ تھوڑے سے پیسے مل جائیں تاکہ میں یہاں سے دور نکل جاؤں ۔ انہوں نے بتایا کہ تم الٰہ آباد سے پچاس میل دور آ گئے ہو .....

"معلوم نہیں وہ بے ہوشی تھی یا نیند کہ میرا سر ڈولنے لگا ۔ مولوی صاحب نے مجھے فرش پر سو جانے کو کہا ۔ ایک کمبل ان کے کمرے میں پڑا تھا وہ مجھے دے دیا اور باہر جا کر دروازہ باہر سے بند کر کے چلے گئے ۔ میں بیہوشی کی نیند سو گیا ۔ صبح اذان کی آواز پر میری آنکھ کھلی ۔ وہ اذان آج بھی میرے ذہن میں گونج رہی ہے ۔ دل میں اتر جانے والی اتنی سریلی آواز میں نے نہ کبھی سنی تھی نہ سنوں گا ۔ اذان کے بعد مولوی صاحب نے کمرہ کھولا ۔ میں اٹھ بیٹھا ۔ انہوں نے پوچھا کہ بیڑیاں کس طرح کھلتی ہیں ۔ میں نے بتا دیا ۔ وہ چلے گئے .....

"نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ میرے پاس آئے ۔ اس وقت سورج نکلنے والا تھا ۔ ایک لڑکا مجھے دودھ اور پراٹھے دے گیا ۔ مولوی صاحب پھر باہر چلے گئے ۔ ایک گھنٹے بعد واپس آئے تو ان کے ساتھ تین بزرگ سے آدمی تھے ۔ انہوں نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں جو میں نے سچ سچ بتا دیں ۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ایک گھر میں جا بٹھایا ۔ ایک آدمی ہتھوڑی اور چھینی لے آیا ۔ کڑوں کے جوڑ کھول دیئے اور میں بیڑیوں سے آزاد ہو گیا ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے دھوکہ نہیں دینگے ۔ میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے انہیں کہا مجھے مسلمان کر لو اور اپنے پاس رکھ لو لیکن ایک سیانے آدمی نے کہا کہ الٰہ آباد کے اتنا قریب رہنا ٹھیک

نہیں .....

"اس مسئلے کا حل یہ نکلا کہ اس قصبے کا ایک فوجی مسلمان چھٹی آیا ہوا تھا ۔ وہ میرٹھ چھاؤنی میں رسالے میں دفعدار تھا ۔ اس نے اپنے ذمے یہ کام لیا کہ مجھے میرٹھ لے جائے گا اور کہیں ملازمت دلا دے گا ۔ میں نے اس گاؤں ، بخت پور کے مولوی علی محمد اجمیری کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا ۔ سات آٹھ دنوں بعد دفعدار صادق الحسن مجھے اپنے ساتھ میرٹھ چھاؤنی لے گئے اور رسالے کے پرائیویٹ ملازموں میں مجھے ملازم کرا دیا ۔ میرا نام منوہر لعل سے منور الحسن رکھا گیا تھا .....

"میرا دماغ ایسا ٹھکانے آیا یا بے ٹھکانہ ہو گیا کہ میں مندر ، مسجد ، گرجے اور گوردوارے کے چکر میں پڑ گیا ۔ میں پوچھتا کہ کیا خدا صرف مسجد میں ہے یا ہر عبادت خانے میں ؟ انسان کیا ہے اور مذہب کیا ہے ؟ مجھے ان سوالوں کے جواب میرٹھ چھاؤنی کی ایک مسجد کے امام مولوی ذکار اللہ نے دیئے ۔ میں ان کا مرید ہو گیا ۔ انہوں نے مجھے بنی نوع انسان سے محبت اور نیکی کے سبق دیئے ۔ قرآن پڑھایا اور پھر میرا ٹھکانہ انہوں نے ہی بنایا ۔ مجھے رسالے کے ہی ایک رسالدار حشمت خان کے حوالے کر دیا ۔ میں نے انہیں اپنی زندگی کی ساری کہانی سنائی تو وہ مجھے اپنے ساتھ ہوشیار پور لے گئے ۔ اپنی زمینوں پر مجھے جا لگایا ۔ انہوں نے میری شادی کرائی اور ۱۹۴۷ء میں میں پاکستان آ گیا ۔"

میں اُس باپ کا بیٹا نہیں

اس کیس کا تعلق دِلّی سے ہے۔ میں کالج میں پڑھتا تھا میرا مضمون نفسیات تھا۔ نفسیات کے طلبار کو عملی سبق کے لیے پاگل خانے لے جایا جاتا ہے جہاں وہ مختلف پاگلوں کے کیس دیکھ کر ان کی باتیں سنتے اور تجزیہ کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں ہماری کلاس کو آگرہ کے پاگل خانے میں لے جایا گیا۔ وہاں ہمیں طرح طرح کے پاگل دکھائے گئے اور ان کے کیس بھی سنائے گئے۔ ہر ایک کیس دردناک تھا لیکن ایک کیس ایسا تھا جس نے میری ساری توجہ اپنی طرف کرلی۔ وہ ایک پاگل تھا جو گھٹنوں میں سر چھپا کر بیٹھا تھا۔ اس کے متعلق پتہ چلا کہ ہر وقت اسی طرح بیٹھا رہتا ہے۔ ایک سال سے اُس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ کبھی سر اٹھاتا تھا تو آسمان کی طرف دیکھنے لگتا تھا اور اچانک بہت ہی بلند قہقہہ لگا کر اچانک چُپ ہو جاتا اور اداس ہو کر اس طرح آسمان کی طرف دیکھنے لگتا تھا جیسے فضا میں اپنے قہقہے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اس کے متعلق بتایا گیا کہ کئی کئی گھنٹے لگاتار آسمان کی طرف ہی دیکھتا رہتا ہے اور پھر جب سر نیچے کرتا ہے تو مُنہ گھٹنوں میں دے لیتا اور بازو ٹانگوں سے لپیٹ کر دن اور رات کا باقی حصّہ اسی حالت میں گزار دیتا ہے۔ وہ لیٹتا نہیں تھا۔ گھٹنوں میں منہ دے کر سو لیتا تھا، اس لیے کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ سویا ہوا ہے یا جاگ رہا ہے۔

میں نے اس کیس کی مکمل تفصیل فراہم کی جو بہت سی دلی پولیس سے حاصل ہوئی اور باقی آگرہ کے پاگل خانے سے۔ اب اگر میں اس پاگل کی کہانی نفسیاتی کیس کے انداز سے سناؤں تو آپ بور ہو جائیں گے۔ میں غیر سائنسی طریقے سے کہانی سناتا ہوں ——— دلی میں ایک تھامسن روڈ ہوا کرتی تھی جس کے دونوں طرف سرکاری ملازمین کے بڑے اچھے کوارٹر تھے۔ ان کے عقب میں کوٹھیوں کی ایک آبادی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں جب جنگ عظیم ختم ہونے والی تھی، وہیں کی ایک کوٹھی میں ہندوؤں کا ایک نوجوان لڑکا عمر پندرہ سولہ سال، قتل ہو گیا۔ اسے کوٹھی کے اندر رات کے وقت قتل کیا گیا تھا۔ لڑکے کے باپ نے پولیس سٹیشن میں رپورٹ دی۔ پولیس نے جا کر لاش دیکھی۔ لاش برآمدے میں پڑی تھی۔ اس کا پیٹ چاقو یا خنجر سے چیرا گیا تھا۔ پیٹ کے تمام اعضا باہر آ گئے تھے۔ یہی ایک زخم تھا اور یہ زخم اتنا لمبا تھا کہ دل سے لے کر نیچے دائیں کولہے تک چلا گیا تھا۔ چاقو دور اندر تک کاٹتا گذر گیا تھا۔

پولیس نے لڑکے کے باپ سے پوچھا کہ اس کے خاندان کی یا لڑکے کی ذاتی طور پر کسی کے ساتھ دشمنی ہے؟ باپ نے بتایا کہ خاندان کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ لڑکے کے متعلق اسے معلوم نہیں تھا کہ کس کے ساتھ دوستی اور کس کے ساتھ دشمنی تھی۔ لڑکے کا باپ فوج میں میجر تھا اور چھ مہینے پہلے جاپانیوں کی قید سے رہا ہو کر آیا تھا۔ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ برما، سنگاپور اور ملایا وغیرہ سے جاپانی پسپا ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی اور گورا افواج کے ہزارہا جنگی قیدی پکڑے تھے جنہیں انہوں نے مختلف جگہوں میں بھیج دیا تھا۔ ان میں سے تھوڑی سی تعداد سنگاپور ملایا وغیرہ میں تھی۔ جاپانی پسپا ہوئے تو ان چند ایک قیدیوں کو وہیں چھوڑ گئے۔ یہ ہندو میجر جس کا نام کے۔ ایل ورما تھا، انہی چند خوش نصیب قیدیوں میں تھا جنہیں اتحادی فوجوں نے ملایا سے رہا

کرالیا اور ہندوستان بھیج دیا تھا۔ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میجر ورما قید میں ساڑھے تین سال رہا تھا۔ اسے قید کی اذیتوں کی وجہ سے تین مہینے چھٹی دے دی گئی تھی۔

وہ گھر آیا تو اپنے جس بیٹے کو وہ دس سال کی عمر کا چھوڑ کر برما گیا تھا وہ پندرہ سولہ سال کا ہو چکا تھا۔ ورما ساڑھے چار سال تک چھٹی نہیں آ سکا تھا۔ مقتول اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ میجر ورما کی چھٹی پندرہ سولہ روز رہ گئی تھی کہ اس کا اکلوتا بیٹا قتل ہو گیا۔ مقتول کی ماں تو ایسی بے ہوش ہوئی کہ آٹھویں روز ہوش میں آئی۔ مقتول اس کا ایک ہی بچہ تھا۔ ماں نے ہوش میں آ کر ناخنوں سے اپنا منہ لہولہان کر لیا۔ ڈاکٹر نے اسے مارفیا کا انجکشن دے کر سلا دیا۔ بہرحال ماں کی حالت کا میری کہانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میجر ورما نے پولیس کو اطلاع دی۔ وہ روتا تھا لیکن مردوں کی طرح اپنے آپ کو سنبھال لیتا تھا۔ وہ فوجی تھا۔ ہزاروں لاشیں دیکھ آیا تھا مگر پولیس کو وہ کوئی ایسی بات نہ بتا سکا جس سے کوئی سراغ ملتا۔ گھر سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ قتل ڈکیتی کی نیت سے نہیں بلکہ قتل کی نیت سے کیا گیا تھا۔

پولیس کے سامنے ایک اور سوال یہ تھا کہ لڑکا قتل کہاں ہوا ہے؟ اپنے کمرے میں یا برآمدے میں جہاں اس کی لاش پڑی تھی؟ ——— لڑکا جس کمرے میں سویا کرتا تھا یعنی اس رات جس کمرے میں سویا تھا وہاں فرش پر یا اس کے بستر پر خون کا کوئی نشان نہیں تھا۔ البتہ اس کے باپ کے کمرے کے اس دروازے کی دہلیز پر جو برآمدے کی طرف کھلتا تھا خون کے صاف نشان تھے اور اس سے آگے برآمدے میں خون گرتا گیا تھا۔ ورما کے کمرے کے فرش کو غور سے دیکھا گیا تو ایک جگہ خشک خون کا بڑا سا دھبہ نظر آیا لیکن یہ گاڑھے خون کا دھبہ نہیں تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے گلابی رنگ کا پانی گرا ہو۔ پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ لڑکا برآمدے میں قتل

ہوا ہے اور شاید باپ کے کمرے تک آیا ہوگا اور وہاں سے واپس چل پڑا ہوگا اور گر پڑا ہوگا۔ باپ پر تو شک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس نے اپنے اکلوتے اور کمسن بیٹے کو قتل کیا ہے۔ باپ بیٹا چار پانچ سال کی جدائی کے بعد ملے تھے۔

ورما کی بیوی اُس رات اپنے والدین کے گھر سوئی تھی کیونکہ اُس کی ماں کو دمے کا ایسا دورہ پڑا تھا کہ اس کے بچنے کی امید نہیں رہی تھی۔ ورما کی بیوی شام سے پہلے پہلے ماں کے گھر چلی گئی تھی۔ گھر میں ورما اور اُس کا بیٹا تھا۔ ایک نوکر بھی گھر میں تھا جس کے متعلق پولیس نے بہت چھان بین کی اور اسے بے ضرر اور بے قصور پایا۔

پولیس نے مقتول کے ہم جماعتوں سے بہت کچھ پوچھا۔ ان سے اس کے دوستوں کا سُراغ ملا۔ ان میں سے دو اُس کے رازداں نکلے۔ پولیس نے ساری توجہ اُن پر مرکوز کر دی۔ دونوں لڑکوں نے پورا پورا تعاون کیا۔ ان سے یہ کام کی بات معلوم ہوئی کہ سول سروس کے ایک سکھ آفیسر کی بیٹی کے ساتھ مقتول کے مراسم تھے۔ وہ لڑکیوں کے سکول میں پڑھتی تھی۔ اسی لڑکی کے ساتھ ایک اور سکول کا لڑکا تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقتول، یہ لڑکا اور لڑکی دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ تینوں امیر گھرانوں کے تھے اور پوری طرح آزاد تھے۔ مقتول کے رویے کے متعلق اس کے دوستوں نے بتایا کہ اپنے آپ کو وہ بہت بہادر اور دلیر ظاہر کرتا تھا۔ اسی لیے اسے ٹارزن کی فلمیں زیادہ پسند آتی تھیں۔ اس کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ کسی کمزور سے لڑکے کو دیکھتا تو اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کرتا تھا کہ تمہارا جسم کمزور ہے لیکن دل کمزور نہیں ہونا چاہیے۔ بہادر بنو۔

مزید انکشاف ہوا کہ سکھ آفیسر کی لڑکی کی رقابت میں اُس نے اپنے رقیب لڑکے کو ایک بار پیٹا بھی تھا۔ پولیس آفیسر نے کرید کرید کر پوچھا تو لڑکوں نے بتایا کہ وہ بہادری کی ایکٹنگ نہیں کرتا تھا بلکہ وہ واقعی بہادر تھا اور بلاوجہ لڑتا جھگڑتا نہیں تھا۔ مقتول کے ہیڈ ماسٹر اور تین دوسرے ماسٹروں نے رائے دی کہ یہ لڑکا لڑاکا یا جھگڑالو نہیں تھا۔ اس کی شخصیت ایک اچھے سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ کردار بھی پختہ تھا۔ شخصیت بھی پختہ اور اس میں ذہانت اور خود اعتمادی تھی۔ اس نے کھوکھلی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔ وہ اپنے باپ کی طرح فوجی افسر بننا چاہتا تھا لیکن وہ صرف افسر نہیں بلکہ جنگجو بننے کا ارادہ رکھتا تھا، اور وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور وہ آزاد ہندوستان کی فوج کا افسر بنے گا ——

بہرحال لڑکے کا کردار واضح ہو گیا۔ پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ واقعی دلیر تھا اس لیے قاتل نے اسے سوتے میں قتل کیا ہے یا دھوکے میں اسے برآمدے میں بلا کر وار کر گیا ہے۔

پولیس سکھ آفیسر کی بیٹی سے ملنے گئی تو سکھ نے اودھم بپا کر دیا۔ وہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی کے کسی لڑکے کے ساتھ تعلقات ہیں لیکن ایک نوجوان لڑکا قتل ہو گیا تھا۔ تفتیش کے راستے میں کوئی آدمی رکاوٹ نہیں بن سکتا، لیکن سکھ نے اپنی افسری کا پورا پورا استعمال کیا۔ پولیس انسپکٹر جو تفتیش کر رہا تھا، ہندو تھا۔ اُس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو اطلاع دی۔ ڈی۔ ایس۔ پی پارسی تھا۔ اُس نے سکھ افسر کو بُلا کر خبردار کیا کہ اُس نے اپنی بیٹی کو تفتیش میں شامل نہ کیا تو اُس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ آخر لڑکی پولیس کے پاس آ گئی۔ کہتے ہیں کہ وہ معمولی طور پر خوب صورت لڑکی تھی، اور یہ بھی سُنا ہے کہ پارسی ڈی ایس پی نے اسے دیکھ کر کہا تھا کہ اس لڑکی کا حُسن کسی بھی بزدل آدمی کو قاتل بنا سکتا ہے اور قتل کا باعث یہی لڑکی ہے۔ وہاں سے ڈی۔ ایس۔ پی ذاتی طور پر اس کیس میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے لڑکی سے پوچھ گچھ خود

[..]لی لڑکی نے یہ تسلیم کرلیا کہ مقتول کے ساتھ اُس کی دوستی تھی لیکن یہ
[..]تی کیسی تھی؟ اُس نے یہ نہ بتایا۔ پولیس کو اس سے دلچسپی بھی نہیں
[..]تھی کہ اس کے تعلقات جائز تھے یا ناجائز۔ لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ وہ مقتول کے ساتھ چند بار پکچر دیکھنے بھی گئی تھی اور وہ تحفوں کا تبادلہ بھی کیا کرتے تھے۔

لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ دوسرے لڑکے کے ساتھ بھی اُس کا دوستانہ رہ چکا تھا۔ پھر اُسے مقتول سکولوں کے کھیلوں کے مقابلے میں پہلی بار ملا تھا۔ وہ فٹ بال کا بہترین کھلاڑی تھا۔ لڑکی کو اس کی جسمانی پھرتی اور جسم کی بناوٹ بہت اچھی لگتی تھی، اور جب وہ اس کی دوست بن گئی تو اُسے مقتول کی دلیرانہ باتیں اور نظریات اچھے لگے۔ وہ آزاد ہندوستان کا بہادر فوجی افسر بننا چاہتا تھا۔ دوسرے لڑکے سے بھی وہ کبھی کبھی مل لیتی تھی لیکن اُس لڑکے کے خیالات اچھے نہیں تھے۔ ایک روز مقتول نے اُسے خوب پیٹا تھا۔ پھر قتل سے دو روز پہلے مقتول نے اس لڑکے کو لڑکی کی موجودگی میں کہا تھا کہ وہ اس لڑکی سے ملنے سے باز آجائے، ورنہ مقتول اسے قتل کر دے گا۔ اس لڑکے نے جواب دیا تھا ___ "دیکھتا ہوں کہ کون کسے قتل کرتا ہے" ___ اور وہ چلا گیا۔ دو روز بعد مقتول قتل ہو گیا۔

اس لڑکے کو شاملِ تفتیش کیا گیا۔ لڑکے نے اُن تمام باتوں کی تصدیق کی جو لڑکی نے پولیس کو بتائی تھیں لیکن قتل کے متعلق اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور جب لڑکے نے یہ بتایا کہ قتل کی رات اُس نے اپنی بہن کے ساتھ ایک ہسپتال میں گزاری تھی تو پولیس ہسپتال پہنچی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ لڑکے کی بہن کو پہلا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ رات نو بجے اُسے ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ لڑکا ہسپتال کے لیبر رُوم کے باہر موجود رہا جس کی شہادت دو نرسوں اور لیڈی ڈاکٹر نے بھی دی جس نے اس کی بہن کا کیس کیا تھا۔ بچہ رات اڑھائی بجے پیدا ہوا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اس لڑکے کو باہر آکر خوشخبری سنائی۔ لڑکا بنچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کو اس پندرہ سولہ سال کی عمر کے لڑکے پر رحم آگیا۔ اسے وہ ڈیوٹی نرس کے کمرے میں لے گئی اور اسے وہاں سُلا دیا تھا۔ وہ صبح چھ بجے کے بعد جاگا تھا۔ چنانچہ لڑکا صاف بچ گیا۔ اس پر شک بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس نے مقتول کو قتل کیا ہے۔

پارسی ڈی۔ ایس۔ پی نے اب تک کی تفتیش کو غور سے پڑھا اور انسپکٹر سے ساری تفصیلات سُنیں۔ اُس کا دماغ خون کے دھبوں پہ جا اٹکا اور اُس نے انہی پر تفتیش کو مرکوز کر دیا۔ لڑکے کی لاش برآمدے میں پڑی تھی۔ خون اس کے باپ کے کمرے کے برآمدے والے دروازے کی دہلیز سے شروع ہوا تھا۔ باپ کے کمرے کے فرش پہ گلابی رنگ کا دھبہ تھا۔

پارسی نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ پیٹ میں چاقو مارا جائے تو خون کا رنگ اسی طرح گہرا لال ہوتا ہے جس طرح ٹانگ یا بازو یا کسی پٹھے سے نکلتا ہے؟ ___ ڈاکٹر نے بتایا کہ پیٹ کا اندرونی حصہ چاک ہو جائے اور انتڑیاں بھی کٹ جائیں تو خون کے ساتھ کچھ پانی بھی نکلتا ہے جو خون کے رنگ کو ہلکا کر دیتا ہے۔ فرش پہ جو گلابی نشان تھا وہ پیٹ کے خون اور پانی کا ہو سکتا ہے۔

لڑکی کو ایک بار پھر ڈی۔ ایس۔ پی نے بلایا۔ اُس کے ذہن میں چند اور سوال پیدا ہو گئے تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس سے پوچھا ___ "تم کبھی مقتول کے گھر بھی گئی تھیں"؟ ___ لڑکی نے بتایا کہ وہ کئی بار اُس کے گھر گئی تھی، اور مقتول کی ماں اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ مقتول اپنے باپ کے متعلق اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے اپنے دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میرا باپ جنگی قیدی ہے۔ اگر میرا باپ بہادر ہوتا تو وہ مر جاتا، قید نہ ہوتا۔ مقتول اپنے باپ کو بزدل سمجھا کرتا تھا۔ پھر اس

کا باپ رہا ہو کر آگیا تو لڑکی تین چار بار اُس کے گھر گئی تھی۔ مقتول کا باپ اسے بہت پسند کرتا تھا بلکہ ایک بار لڑکی مقتول سے ملنے گئی تو وہ گھر نہیں تھا۔ اُس کے باپ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے بال کی کھال اتارنی شروع کر دی اور لڑکی سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ مقتول کے باپ کا انداز کیسا تھا، اس نے لڑکی سے طرح طرح کے بے شمار سوال پوچھے۔ لڑکی کی عمر سولہ سال تھی۔ ذہن ابھی کچا تھا۔ اس نے صاف بتا دیا کہ مقتول کے باپ کا رویہ اس کے ساتھ باپ والا یوں کہیئے کہ بزرگوں والا نہیں تھا۔ میجر ورما کی عمر اڑتیس سال اور چند مہینے تھی اور وہ عمر سے کم لگتا تھا۔ اُس کی بیوی موٹے اور بھدّے سے جسم کی عورت تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے سوچا کہ ایسی بیوی کے مقابلے میں ورما یقیناً اس لڑکی کو پسند کرتا ہو گا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے فوج کے تین چار ایسے افسروں سے جو میجر ورما کو اچھی طرح جانتے تھے، درپردہ اس کے چال چلن کے بارے میں پوچھا۔ پتہ چلا کہ وہ شراب پیتا ہے اور عورتوں کا شکاری ہے اور یہ بھی کہ وہ رنگین طبیعت کا آدمی ہے۔ پارسی ڈی۔ ایس۔ پی نے لڑکی کو ایک بار پھر بلایا اور پوچھا کہ مقتول کا رویہ اپنے باپ کے ساتھ کیسا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ میجر ورما قید سے رہا ہو کر آیا تو مقتول خوش تھا لیکن کوئی ایک مہینہ بعد وہ اپنے باپ کو ناپسند کرنے لگا۔ آخر میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے اپنے باپ سے نفرت ہو گئی ہو۔ اُس نے ایسی ناپسندیدگی یا حقارت کی کوئی وجہ کبھی نہیں بتائی تھی۔

پارسی نے لڑکی سے پوچھا ——— "تم نے مقتول کو بتایا تھا کہ میجر ورما تمہیں بُری نظر سے دیکھتا ہے"؟

لڑکی پہلے تو جھجکی، پھر پارسی کی حوصلہ افزائی سے اُس نے جواب دیا ——— "پہلے تو نہیں بتایا۔ جب چیری نے اپنے باپ کو ناپسند کرنا

شروع کر دیا تو میں نے اسے بتا دیا کہ تمہارا ڈیڈی اچھا آدمی نہیں ہے"۔

(لڑکی مقتول کو پیار سے چیری کہا کرتی تھی۔ اس کا نام چرن داس ورما تھا)

ایک اور سوال کے جواب میں لڑکی نے بتایا ——— "یہ سُن کر چیری کو غصہ آگیا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ یہ شخص میرا باپ نہیں ہے۔ میں کسی اور کا بیٹا ہوں۔ اگر اس کا بیٹا ہوتا تو میں اسی کی طرح بزدل اور بدنیت ہوتا"۔

میجر ورما کی چھٹی ختم ہو چکی تھی اور وہ جی۔ ایچ۔ کیو دلی میں چلا گیا۔ چھٹی کے بعد وہ گھر آجایا کرتا تھا۔ اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کی گئی، لیکن اس نے وفادار بیوی کی طرح اپنے خاوند کے خلاف کوئی بات منہ سے نہ نکالی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ باپ بیٹا کچھ کھچے کھچے رہنے لگے تھے۔ بیٹا اپنے باپ کو پسند نہیں کرتا تھا ——— ڈی۔ ایس۔ پی اب اس شک کی بنا پر تفتیش کا رُخ بدلنے کی سوچ رہا تھا کہ باپ بیٹا رقیب تھے۔

ایک شام یہ پارسی ڈی۔ ایس۔ پی میجر ورما کے گھر گیا اور اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میجر ورما نے نوکر کو بلا کر چائے کے لیے کہا اور یہ بھی کہا کہ میری دوائی لے آؤ۔ نوکر دو شیشیاں اور پانی کا گلاس لے آیا۔ میجر ورما نے دونوں میں سے ایک ایک گولی نکال کر کھالی اور پانی پیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے دونوں شیشیوں کے لیبل پڑھے۔ اس پارسی پولیس آفیسر نے اُس کی بیماری کے متعلق پوچھا تو میجر ورما نے کہا کہ اعصابی دباؤ اور ذہنی انتشار کی تکلیف ہے۔ اُس نے میجر ورما کی بیماری میں اس طرح دلچسپی لینی شروع کر دی جیسے اسے اس کے ساتھ بہت ہمدردی ہو۔ اُس نے پوچھا کہ ان کے علاوہ وہ کونسی دوائی لیتا ہے۔ اُس نے ایک اور دوائی کا نام بتایا۔ اس کے علاوہ طاقت کے انجکشن بھی تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی کو معلوم تھا کہ یہ دوائیاں ذہنی سکون کے لیے دی جاتی ہیں اور ایسے مریضوں کو دی جاتی ہیں جنکا ذہنی توازن پاگل پن کی حد تک بگڑ گیا ہو۔ اسے کچھ شک ہوا۔ بہرحال اس شک کو چھپا کر

اُس نے مشورہ دیا کہ کسی سپیشلسٹ سے معائنہ کرائے۔ میجر ورما نے اُسے بتایا کہ وہ ایک انگریز کرنل سے علاج کرا رہا ہے جو فوج میں دماغی اور نفسیاتی امراض کا سپیشلسٹ ہے۔ اُس نے کرنل کا نام بھی بتا دیا۔

دوسرے ہی دن ڈی۔ ایس۔ پی اس انگریز کرنل سے ملا اور اپنا تعارف کرا کے اس سے پوچھا کہ میجر ورما کے مرض کی نوعیت کیا ہے۔ کرنل کو معلوم تھا کہ ورما کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کرنل کو بتا دیا کہ وہ تفتیش کے سلسلے میں یہ معلومات فراہم کر رہا ہے۔ اُس نے کرنل سے کہا ——— "آپ کا بیان ہو سکتا ہے کہ کورٹ میں استعمال کیا جائے اس لیے سوچ سمجھ کر جواب دیں"۔

انگریزوں میں صاف گوئی اور قانون کے احترام کا وصف تھا۔ کرنل نے فوراً پوچھا ——— "کیا آپ کو یہ شک ہے کہ میجر ورما نے خود اپنے بیٹے کو قتل کیا ہے"؟ ——— ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا ——— "شک نہیں۔ مجھے کچھ یقین ہوتا جا رہا ہے۔ صرف ایک معمہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ بیٹا باپ کے کمرے میں قتل ہوا ہے۔ وہ اس کمرے میں کیوں گیا تھا؟ مجھے جواب نہیں مل رہا۔ اب یہ رائے آپ دیں گے کہ میرا شک بے بنیاد ہے یا صحیح"۔

"دونوں باتیں ہو سکتی ہیں"۔ کرنل نے کہا "میجر ورما اس ذہنی کیفیت میں قتل کر سکتا ہے۔ وہ ایک فوبیا (خوف) کا شکار ہے"۔ کرنل نے اُس کے ذہنی مرض کو تفصیل سے بیان کر دیا اور آخر میں کہا ——— "میں یہ رائے نہیں دوں گا کہ قاتل میجر ورما ہے۔ یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس خوف کے مریضوں کے متعلق بہت سے سوال پوچھے اور اس سے دو تین کیس بھی سُنے۔ ان میں ایک کیس ایسا تھا جس نے اس ذہنی مرض کے دورے کی کیفیت میں قتل بھی کیا تھا۔ بہت سی معلومات حاصل کر کے وہ کرنل سے رخصت

ہوا۔ دوسرے دن اُس نے اپنے محکمے کی طرف سے جی۔ ایچ۔ کیو کو چٹھی لکھی کہ میجر ورما کے بیٹے کے قتل کے سلسلے میں میجر ورما کی ضرورت ہے۔ اسے غیر معینہ مدت کے لیے پولیس کی تفتیش میں شامل کیا جائے اور اگر اسے حراست میں لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو جی۔ ایچ۔ کیو سے باقاعدہ اجازت لی جائے گی۔

میجر ورما پولیس کے پاس آ گیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس کے ساتھ ہمدردانہ لہجے میں باتیں شروع کیں اور آہستہ آہستہ باقاعدہ تحقیقات کا رنگ اختیار کر لیا۔ وہ اُس سے زیادہ تر اُس کی بیماری کے متعلق باتیں پوچھ رہا تھا۔ میجر ورما بیماری کے متعلق کسی سوال کا جواب دے چکتا تو ڈی۔ ایس۔ پی پوچھتا ——— "آپ کے بیٹے کا خون آپ کے کمرے سے نکلنا شروع ہوا اور دروازے تک جا کر خون کا بہاؤ بند ہو گیا.... اچھا تو یہ اعصابی یا ذہنی تکلیف آپ کو کب سے ہے؟ بڑی نامراد بیماری ہے" ——— اور جب میجر ورما اس سوال کا جواب دیتا تو ڈی۔ ایس۔ پی اُس کے بیٹے کے قتل کی کوئی بات کہہ دیتا۔ یہ بڑی ہی دانشمندانہ تفتیش تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی اس سے لگاتار سات گھنٹے سوال پوچھتا رہا۔ کبھی وہ اُس کی بیماری کی باتیں کرتا، کبھی قتل کی اور کرتے کرتے ڈی۔ ایس۔ پی اس قسم کی باتوں پر آ گیا ——— "آپ کا بیٹا آپ کے کمرے میں آیا تو آپ کو پتہ نہ چل سکا کہ اس کا پیٹ پھٹا ہوا ہے"؟ ——— ورما کچھ بول ہی رہا تھا کہ پارسی نے کہا ——— "آپ کو پتہ بھی کیسے چلتا۔ آپ کا بیٹا جب آپ کے کمرے میں آیا تو اُس کا پیٹ پھٹا ہوا نہیں تھا"۔

سات گھنٹوں بعد میجر ورما کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ چہرے سے پسینہ پھوٹ آیا حالانکہ موسم سردی کا تھا۔ وہ سخت گھبرا گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی سی آ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ مٹھیاں بند ہونے لگیں ——— اس پر ذہنی بیماری کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اُس نے دانت

پیس لیے۔ ڈی۔ ایس۔ پی اسی کیفیت کا منتظر تھا۔ وہ انگریز کرنل سے بہت سی معلومات لے آیا تھا۔ وہ سوالوں سے ورما پر بیک وقت کئی پہلوؤں سے حملے کر رہا تھا۔ وہ دراصل اس کے اعصابی نظام کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں وہ کامیاب ہو گیا۔ اُس نے میجر ورما سے کہا ——— "اسی حالت میں آپ نے اپنے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ آپ نے چاقو سے اس کا پیٹ چیر دیا تھا۔"

"نہیں۔ نہیں۔" میجر ورما نے دانت پیس کر کہا ——— "میں نے اُس جاپانی کو قتل کیا تھا جو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا، مگر وہ مرا نہیں۔ وہ پھر آ گیا ہے۔ میں نے اُس کا پیٹ چیر دیا تھا مگر وہ پھر آ گیا ہے۔"

فوراً ہی بعد میجر ورما نارمل حالت میں آنے لگا اور جلدی ہی اس کی حالت سُدھر گئی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے تھانے کے انچارج سے کہا کہ وہ کسی بڑے ہوٹل سے ان کے لیے کھانا منگوا دے اور اُس نے میجر ورما سے کہا ——— "آپ اپنے ذہن سے بوجھ اتار دیں۔ یہ قتل آپ کو ساری عمر ایسا پریشان رکھے گا کہ آپ نہ جئیں گے نہ مریں گے۔ میں نے آپ کو بچانے کا انتظام کر لیا ہے۔ آپ نے ایسی حالت میں قتل کیا ہے جب آپ کی عقل اور ہوش پہ پاگل پن غالب تھا..... پہلے یہ بتائیے کہ وہ جاپانی کون تھا جس کا آپ نے چاقو سے پیٹ چیرا تھا؟ آپ کے ذہن پہ جاپانیوں کی قید کا اثر معلوم ہوتا ہے۔"

میجر ورما کے آنسو نکل آئے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اُس سے ہمدردانہ باتیں کیں اور اُس کے دل پر قبضہ کر لیا۔ میجر ورما نے کہا ——— "میں آپ کو شروع سے ساری بات سناتا ہوں۔ اکلوتے بیٹے کا قتل ہو جانا میرے لیے معمولی حادثہ نہیں ہے۔ مجھے فوراً اقبالِ جرم کر لینا چاہیئے لیکن میں اتنا لمبا عرصہ جاپانیوں کی قید میں گزار کر آیا ہوں۔ اب پھر قید ہونے سے خوف آتا تھا۔ اگر کوئی مجھے یہ یقین دلا دیتا کہ مجھے

فوراً گولی مار دی جائے گی تو میں اقبالِ جرم کر لیتا۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، قید سے ڈرتا ہوں.....

"جب جاپانیوں نے حملہ کیا تو میں سنگاپور میں تھا۔ وہاں انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور ہم جنگی قیدی بن گئے۔ جاپانیوں نے افسروں کو الگ کر لیا اور ہماری باقی فوج کو کہیں اور لے گئے۔ پہلے پانچ چھ مہینے جاپانیوں نے ہمیں بہت اذیّتیں دیں۔ کئی کئی دن بھوکا رکھا۔ ہم سے بھنگیوں کا کام بھی کرایا۔ ہم سے مویشیوں کی طرح مشقت لی۔ کسی سے ذرا سی غلطی ہو جاتی تو اُسے گولی مار دیتے تھے۔ ایک روز انہوں نے تین انگریز افسروں کو ہمارے سامنے گولی مار دی اور ہمیں کہا کہ ان کی لاشیں گھسیٹ کر جنگل میں لے جاؤ.....

"انگریز قیدی افسروں نے لاشیں گھسیٹنے سے انکار کر دیا۔ پھر ہندوستانی افسروں کی باری آئی تو ہم نے بھی انکار کر دیا۔ ہمیں پھر حکم ملا کہ لاشیں گھسیٹو۔ ہم سب نے آپس میں بات کی اور فیصلہ کیا کہ یہ ناگوار کام کرنا ہی پڑے گا۔ سولہ افسر لاشیں گھسیٹنے کے لیے آگے آ گئے۔ میں بھی اُن میں تھا۔ سات انگریز افسر تھے۔ جاپانیوں نے ہم سولہ افسروں کو الگ کھڑا کر دیا اور باقیوں کو رسّیاں دے کر کہا کہ وہ لاشیں گھسیٹ کر لے جائیں۔ انہوں نے پھر انکار کر دیا تو جاپانیوں نے سنگینوں سے ایک ایک افسر کو مارنا شروع کر دیا۔ یہ منظر بڑا ہی بھیانک تھا.....

"ہم جو سولہ افسر رہ گئے تھے انہیں جاپانی فوجی بارکوں میں لے گئے جہاں وہ خود رہتے تھے اور ہمیں الگ الگ کمرے دے دیئے۔ دراصل وجہ یہ تھی کہ جاپانیوں کو چند ایک وفادار افسروں کی ضرورت تھی۔ وہ ہندوستان پر بھی قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ یہاں کی رہنمائی کے لیے اور دیگر انتظامات کے لیے وہ ہمیں تیار کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ سنگاپور کے انتظام کے لیے بھی انہیں ایسے مقامی افسروں کی ضرورت

تھی جو وفادار ہوں، مگر ہماری وفاداری کو آزمانے کے لیے یا ہمیں وفادار بنانے کے لیے انہوں نے ہم سے گدھوں کی طرح کے کام لینے شروع کر دیئے۔ وہ ہماری خودداری اور ذاتی وقار کو ہمارے ذہنوں سے نکال دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے حیوانوں کی سی مشقت، فاقہ کشی اور لیکچروں سے ہماری برین واشنگ شروع کر دی اور جب قید کا ایک سال پورا ہو چکا تھا، ہم سدھائے ہوئے بندر بن گئے تھے۔ پھر وہ ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنے لگے۔ کھانا پورا اور اچھا دینے لگے۔ مشقت بھی ختم ہو گئی اور ہم افسروں کی طرح رہنے لگے.....

"جاپانیوں کے قد چھوٹے تھے۔ ان میں ایک افسر خاصے لمبے قد اور دُبلے پتلے جسم کا تھا۔ دوسرے جاپانی افسر ہم سولہ قیدی افسروں سے بہت اچھا سلوک کرنے لگے تھے لیکن یہ لمبا جاپانی ہم سب سے، انگریز اور ہندوستانی افسروں سے' نفرت کرتا تھا۔ تین جاپانی افسر انگریزی بولتے تھے۔ یہ لمبا جاپانی انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ایک شام جاپانی افسروں نے ہم قیدی افسروں کو اپنے میس میں کھانے پر بلایا اور کہا کہ آئندہ ہم ان کے ساتھ کھانا کھایا کریں گے۔ ہم سب جب کھانے پر بیٹھے تو اس لمبے جاپانی نے اپنی زبان میں واویلا بپا کر دیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے بالکل پسند نہیں کہ قیدی، جاپانی افسروں کی برابری کریں لیکن وہاں اب یہ فضا پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ہمیں جاپانی زبان پڑھاتے تھے اور ہم انہیں انگریزی اور اُردو کا سبق دیتے تھے۔ لمبے جاپانی نے کھانے پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تو اُس کے ساتھی افسروں نے اُس سے غصے میں باتیں کیں.....

"اُس کی نفرت بڑھتی گئی۔ ایک صبح معلوم ہوا کہ ایک انگریز کرنل اپنے کمرے میں مرا پڑا ہے۔ ہم دیکھنے گئے۔ اُس کا پیٹ چاقو سے چیرا ہوا تھا۔ اُس پر سوتے میں حملہ کیا گیا تھا۔ اُسے دفن کر دیا گیا۔ پھر ہمیں

معلوم نہیں کہ جاپانیوں نے اس سلسلے میں کیا کارروائی کی..... کوئی دس دن بعد ایک ہندوستانی لفٹیننٹ اسی حالت میں مرا ہوا پایا گیا۔ اُس کا بھی رات کے وقت پیٹ چیرا گیا تھا۔ ہم نے جاپانیوں سے احتجاج کیا تو انہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ مجرم کا سُراغ لگا رہے ہیں۔ اُسے سب کے سامنے سزا دی جائے گی، مگر کوئی مجرم سامنے نہ آیا۔ دس ہی دن بعد ایک انگریز میجر کو صبح دیکھا گیا۔ بستر پہ مرا پڑا تھا۔ اس کا بھی پیٹ چیرا ہوا تھا.....

"اس تیسرے قتل کے بعد مجھ پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ اب میری باری ہے اور ایک صبح میری لاش اٹھائی جائے گی اور میرے ساتھی دیکھیں گے کہ میرا پیٹ چیرا ہوا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ہم الگ الگ کمروں میں رہتے تھے لیکن قیدی افسروں کو کھڑکیاں اور دروازے بند رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں سے فرار کی تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ برما تک جاپانی قابض تھے۔ سارا سمندر ان کے قبضے میں تھا..... رات کو میں سو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ مجھ پر اس خوف کا قبضہ ہو گیا تھا کہ اب میری باری ہے۔ جاپانیوں نے ایک سال کی اذیتوں سے ہماری دلیری اور مردانگی ختم کر دی تھی۔ میں اب بالکل بزدل اور ڈرپوک انسان بن چکا تھا۔ ایک مہینے تک کوئی اور قیدی قتل نہ ہوا، مگر میری ذہنی حالت بگڑتی گئی۔ اب میں پوری پوری رات جاگتا رہتا تھا.....

"ایک مہینے بعد ایک مسلمان کیپٹن کا پیٹ چیرا گیا۔ صبح کے وقت اُس کی لاش اُس کے کمرے کے فرش پر پڑی دیکھی گئی۔ بستر پر بھی خون تھا لیکن وہ تڑپ کر یا شاید اُٹھ کر فرش پہ گرا تھا۔ جاپانی افسروں نے ہمیں بہلانے کے لیے بہت شور شرابا کیا لیکن کوئی کارروائی نہ کی۔ اس چوتھے قتل کے بعد میری ذہنی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی۔ میرے ساتھی افسروں کی حالت ایسی نہیں تھی.....

"پھر ایک اور مہینہ گزر گیا۔ ایک رات جب آدھی رات گزری تھی مَیں جاگ رہا تھا۔ مجھے برآمدے میں کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ مَیں ڈر کے مارے چارپائی سے اُتر کر چارپائی کے نیچے چُھپ گیا۔ کمرہ تاریک تھا۔ باہر چاندنی تھی۔ مجھے دروازے میں ایک آدمی سیاہ بھُوت کی طرح کھڑا نظر آیا۔ وہ سایہ سیاہ تھا۔ مَیں نے اُس کے قد بُت سے پہچان لیا۔ وہ وہی لمبا جاپانی تھا جو قیدی افسروں سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے عقب میں چاندنی کی سفیدی تھی۔ اس سے اس کا جسم صاف نظر آتا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ نیچے تھے اور اس کے ایک ہاتھ میں جاپانیوں کی مخصوص چھوٹی سی تلوار تھی۔ میرا جسم پسینے میں نہا گیا.....

"وہ آگے آیا۔ میں خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے بستر پر مجھے جھک کر دیکھا۔ میں وہاں نہیں تھا۔ اس خوف سے میری حرکتِ قلب رُکنے لگی کہ وہ مجھے چارپائی کے نیچے سے نکال لے گا۔ اُس نے بتّی نہیں جلائی کیونکہ بتّیاں جنگ کی وجہ سے نہیں جلائی جاتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ واپس چلا گیا۔ دروازے میں رُکا اور کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر چلا گیا۔ تین چار منٹ بعد میں نے ساتھ والے کمرے سے ہلکی سی چیخ سُنی..... میں نے باقی رات چارپائی کے نیچے کانپتے ہوئے گزار دی اور صبح کے وقت پتہ چلا کہ ساتھ والے کمرے کا انگریز میجر قتل ہو گیا ہے۔ اُس کا پیٹ چیرا ہوا تھا.....

"آپ خود تصوّر کر سکتے ہیں کہ اس کے بعد میری حالت کیا ہوئی ہوگی۔ اس قتل کے بعد وہ لمبا جاپانی کہیں نظر نہ آیا۔ جاپانی افسروں سے اس کے متعلق پوچھا تو سب نے بے رُخی سے جواب دیا۔ "یہیں ہے۔ آجائے گا" "انہیں چاہیئے تھا کہ ہمیں بتا دیتے کہ اُسے کسی دوسری جگہ تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن انھوں نے ہمارے دِلوں پر اُس کا خوف طاری رکھا۔ مجھے تو یقین ہو گیا تھا کہ سب کا قاتل وہی لمبا جاپانی ہے اور جاپانیوں کو تو یقیناً معلوم ہوگا ہی.....

"اُس کے بعد ہم نے اُسے نہیں دیکھا لیکن میرے ذہن میں یہی خوف اٹک گیا ——— "یہیں ہے آجائے گا" ——— پھر لمبے لمبے سال گذر گئے۔ میں نہ جان سکا کہ کتنے۔ وہ نہ آیا مگر وہ کبھی کبھی رات کے وقت مجھے دروازے میں کھڑا نظر آتا اور وہیں غائب ہو جاتا۔ یہ واہمہ تھا لیکن میں چارپائی کے نیچے چُھپ جاتا اور باقی رات تھر تھر کانپتے گزر جاتی۔ دن کے وقت جب میں سب میں مل بیٹھتا یا کام کرتا تو میری حالت نارمل ہو جاتی تھی.....

"لمبی مدت گزر گئی تو ایک روز ہوائی جہازوں کا شور سنائی دیا اور سنگاپور پر بمباری شروع ہو گئی۔ یہ اتحادیوں کا جوابی حملہ تھا جو بہت سخت تھا۔ بمباری روزانہ ہونے لگی اور پھر ایسی حالت پیدا ہو گئی کہ جاپانی بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ ان کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مختصر یہ کہ ایک روز ہم باقی قیدی افسر ایک رات افراتفری میں بھاگ نکلے۔ مجھ میں اتنی دلیری نہیں تھی۔ ہمارا لیڈر ایک انگریز کرنل تھا۔ اُس کی حوصلہ افزائی اور قیادت میں ہم بھاگ نکلے۔ بہت دن چُھپ چُھپ کر چلتے ہم سمندر کے کنارے تک پہنچ گئے۔ جنگ کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ آخر ایک روز آسٹریلیا کی نیوی کی ایک گن بوٹ نے ہمیں دیکھ لیا اور اُٹھا لے گئی۔ ہمیں ایک بڑے بحری جہاز کے سپرد کیا گیا اور ایک دن ہم کلکتہ پہنچ گئے۔ پھر مجھے تین ماہ کی چھٹی گھر بھیج دیا گیا.....

"میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا تو بہت ہی خوش ہوا۔ اسے دس گیارہ سال کا چھوڑ گیا تھا۔ اب وہ سولہ سال کی عمر میں باکسروں کی طرح لگتا تھا۔ وہ مجھے گرم جوشی سے ملا۔ پہلے چند دن تو وہ ہنستا کھیلتا رہا اور جب میں نے اسے اپنے ساتھ بے تکلف کر لیا تو اس نے مجھے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قید ہونا بزدلوں کا کام ہے۔ میں نے اسے اپنی مجبوری سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے اسے قبول نہ کیا۔ گھر میں آ کر بھی اس خوف نے میرا پیچھا نہ چھوڑا کہ ایک جاپانی میرا پیٹ چیرنے کے لئے آ رہا ہے۔ ایک

رات میری آنکھ کھل گئی تو مجھے اچھی طرح نظر آیا کہ دروازے میں لمبا
جاپانی کھڑا ہے اور غائب ہوگیا ہے۔ میری چیخ نکل گئی۔ میری بیوی جو
ساتھ والے پلنگ پر سوئی ہوئی تھی، گھبرا کر جاگ اٹھی۔ اُدھر میرے بیٹے نے
بھی چیخ سن لی اور جاگ کر دوڑتا آیا۔ میں بچوں کی طرح ڈر رہا تھا۔ میں نے
اپنی بیوی اور بیٹے کو سنایا کہ مجھ پر کس قسم کا خوف طاری ہے۔ خوف کا نام
سُن کر میرے بیٹے کا رویّہ بدل گیا۔ اس نے مجھے کہا ـــ ’ڈیڈی! اب
آپ اپنے گھر میں ہیں، اور آپ فوجی افسر ہیں، پھر بھی آپ ڈرتے ہیں‘ ـــ
وہ اپنے کمرے میں چلا گیا.....

”پھر مجھے یہ دَورے کئی بار پڑے۔ میں نے دروازے میں جاپانی
کو کھڑے دیکھا اور میں نے چیخ ماری، پھر میرا پسینہ پھوٹ آیا اور میں
خوف سے کانپتا رہا۔ پھر ایک روز دن کے وقت سوتے ہوئے بھی
میری یہی حالت ہوگئی۔ میرا بیٹا گھر میں تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہمدردی
کرنے کی بجائے یہ کہا ـــ ’میں خوش تھا کہ میں ایک بہادر فوجی افسر کا بیٹا
ہوں لیکن اپنے دوستوں کو بتاتے مجھے شرم آتی ہے کہ میں ایک بزدل آدمی
کا بیٹا ہوں۔ آپ ڈرپوک ہیں۔ آپ وہی ہندو ہیں جس کی دھوتی کا لوگ
مذاق اڑایا کرتے ہیں‘ ـــ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بیٹا
میں نفسیاتی مریض ہوں اور اپنا علاج کرالوں گا لیکن وہ ابھی دسویں جماعت
میں پڑھتا تھا، نفسیات کو نہیں سمجھتا تھا.....

”میں نے اس انگریز کرنل کو جو نفسیات کا ڈاکٹر ہے، اپنی حالت بتائی۔
اس نے مجھے یہ دوائیاں دیں جو آپ نے دیکھی تھیں۔ یہ سب ذہنی سکون
اور نشہ دینے والی ہیں۔ کرنل نے ہفتے میں ایک بار تقریباً نصف گھنٹہ
باتوں سے میرا علاج شروع کر دیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس دوران میرے بیٹے
کی ایک دوست لڑکی اس کے ساتھ گھر آئی۔ میں نے ایسی خوب صورت لڑکی
کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میری نیت خراب ہوگئی۔ اب میں اقبالِ جرم کر رہا ہوں

تو بہتر ہے کہ ہر ایک بات آپ کو سنا دوں۔ ایک درخواست ضرور کروں گا
کہ مجھے قید میں نہ ڈالنا فوراً پھانسی دے دینا یا گولی مار دینا.....

”میں شراب اور عورت کا نشئی رہا ہوں۔ جنگ سے پہلے فوج میں
یہی میری عادت رہی۔ اب محسوس کرتا ہوں کہ انہی دو چیزوں نے مجھے
جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے بے کار کیا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کی دوست
کو دیکھا تو اس کے ساتھ دوستی کا ارادہ کر لیا۔ ایک روز وہ میرے گھر
آئی تو گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے لڑکی سے کچھ دست درازی کی
اور اسے بہلانے پھسلانے اور ورغلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ میری
باتوں میں نہ آئی۔ اب تو میرا بیمار ذہن فرار کی طرف زیادہ مائل رہتا تھا۔ میرا
کردار ختم ہو چکا تھا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ لڑکی میری بیٹی کی عمر کی ہے
اور ہو سکتا ہے میری بہو بن جائے..... اُس روز کے بعد میرا بیٹا مجھ
سے نفرت کرنے لگا اور اس کی میرے ساتھ بول چال بھی بند ہوگئی۔ لڑکی
نے شاید اسے بتا دیا تھا کہ میں نے کیا حرکت کی ہے.....

”میرا بیٹا جب مجھے نفرت سے دیکھتا تھا تو مجھے وہ لمبا جاپانی یاد
آجاتا تھا جس نے میرے ساتھی افسروں کو قتل کیا تھا اور جو ابھی تک واہمہ
بن کر مجھے راتوں کو پریشان کرتا تھا۔ میری ذہنی حالت اور زیادہ بگڑنے
لگی۔ قتل کی رات والے دن ماں بیٹے سے کہا ـــ ’بیٹا، اپنے ڈیڈی
سے یوں ناراض ہوا کرتے ہیں؟‘ ـــ اس نے حقارت سے کہا ـــ ’میں
کسی اور ڈیڈی کا بیٹا ہوں‘ ـــ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اُسے کچھ سخت
الفاظ کہے۔ اس نے مجھے کہا ـــ ’تم بزدل اور ڈرپوک ہو۔ میں کسی بہادر
باپ کا بیٹا ہوں، کسی اور کا..... سُنا تم نے؟..... میں تم جیسے کسی
ہیجڑے کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں کسی ایسے بے غیرت آدمی کا بیٹا نہیں ہوں
جسے اپنی بیوی اور بیٹی میں بھی تمیز نہیں..... میں آج رات تمہارے کمرے
کا پہرہ دُوں گا۔ دیکھتا ہوں کونسا جاپانی تمہیں قتل کرنے آتا ہے‘ ـــ میں

غصے سے کانپتا ہوا باہر نکل گیا اور ایک طوائف کے گھر چلا گیا۔ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے میں فرار حاصل کیا کرتا تھا ......

”شام کے وقت گھر آیا تو میری بیوی اپنی ماں کے پاس جا چکی تھی۔ اس کی ماں کو بہت تکلیف تھی۔ نوکر کھانا لایا تو میں نے اکیلے کھایا۔ میرے بیٹے نے اپنے کمرے میں کھانا کھایا۔ میں نے اپنی گولیاں کھائیں اور ایک ناول پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ رات کا کیا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ لمبا جاپانی ہاتھ میں چھوٹی تلوار لیے میری طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ یہ خواب تھا یا واہمہ؟ مجھے معلوم نہیں۔ وہ مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ آج اس کا مقابلہ کروں گا۔ اسے اسی کی تلوار سے قتل کر کے بیٹے کو بتاؤں گا کہ میں بزدل نہیں ہوں ......

”وہ میرے گھر کا کمرہ نہیں تھا۔ وہ سنگاپور کی بارک کا کمرہ تھا۔ جاپانی دبے پاؤں آگے بڑھا تو میں سپرنگ کی طرح بستر سے اچھلا اور ایک سیکنڈ میں جاپانی کے ہاتھ سے تلوار چھین کر اس کی نوک اس کے دل پر ماری اور نیچے کی طرف جسم کی پوری طاقت سے تلوار کھینچی، تلوار اس کا پیٹ چیرتی ہوئی دائیں کولہے تک چلی گئی۔ مجھے چیخ سنائی دی، پھر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا فوراً صاف ہو گیا۔ میں ہوش میں آگیا .....

”یہ میرے گھر کا کمرہ تھا۔ ایک آدمی آگے کو جھکا ہوا برآمدے کی طرف میرے کمرے سے نکل رہا تھا۔ میں نے لپک کر بجلی کا بٹن دبانے کو دایاں ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کوئی چیز محسوس کی۔ بائیں ہاتھ سے بٹن دبایا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ سب سے پہلی چیز جو دیکھی وہ ایک چاقو تھا۔ یہ میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ یہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ میں برآمدے میں دوڑ کر نکلا جہاں ایک آدمی جا رہا تھا۔ برآمدے کی بتی جلائی تو میرا بیٹا فرش پر پڑا تھا۔ اس کی انتڑیاں اور پیٹ کے سے باہر آ کر فرش پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ مر چکا تھا۔ بعد میں پوسٹ

مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ چاقو سے اس کا دل بھی کٹ گیا تھا۔ میں نے جاپانی کے واہمے پر وار کیا تھا اور اپنے بیٹے کو قتل کر دیا...

”میں آپ کے ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکوں گا کہ میرے ہاتھ میں چاقو کہاں سے آیا تھا؟ کیا میرے بیٹے کے ہاتھ میں چاقو تھا جو میں نے اس پر اچانک جھپٹ کر چھین لیا تھا؟ کیا میرا بیٹا مجھے قتل کرنے آیا تھا؟ کیا میرا بیٹا میرے کمرے کا پہرہ دینے آیا تھا؟ ـــــ اس نے کہا تھا کہ میں رات تمہارے کمرے کا پہرہ دینے آؤں گا۔ دیکھتا ہوں کون جاپانی تمہیں قتل کرنے آتا ہے ـــــ یا شاید سوتے میں میری چیخ نکل گئی تھی جسے سن کر میرا بیٹا ہاتھ میں چاقو لیے میرے کمرے میں آگیا تھا۔ میں کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ چاقو دے سکتا ہوں جس سے میں نے بیٹے کو قتل کیا ہے“۔

اس کے بعد میجر ورما نے اپنی کوٹھی کے باغیچے میں ایک پودے کے نیچے، زمین میں دبایا ہوا چاقو نکال دیا ـــــ کیس جب کورٹ میں گیا تو میجر ورما کے اقبالِ جرم اور چاقو کے سوا کوئی ٹھوس شہادت نہیں تھی تاہم انگریز کرنل کو صفائی کی طرف سے پیش کیا گیا جس نے علمِ نفسیات کی روشنی میں میجر ورما کے کیس کا تجزیہ پیش کیا۔ بالائی کورٹ نے میجر ورما کے اقبالِ جرم اور انگریز کرنل کے بیان کے پیشِ نظر اور صفائی کے وکیل کی درخواست پر ماہرینِ نفسیات کے ایک سرکاری بورڈ کی تشکیل کی۔ اس میں آگرہ کے پاگل خانے کا ڈاکٹر انچارج بھی شامل تھا۔ اس وقت تک میجر ورما پر کبھی نہ ختم ہونے والی خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ وہ صرف نیچے والی کورٹ میں اپنا بیان دے سکا تھا۔ بورڈ نے متفقہ رائے دی کہ ملزم کا ذہنی توازن مکمل طور پر بگڑ چکا ہے اور اس نے قتل ایسی حالت میں کیا ہے جب اس کی عقل پر جاپانی کا واہمہ غالب تھا۔ بورڈ نے ملزم کی ذہنی بیماری کا تجزیہ کیا اور سفارش کی کہ ملزم کو سزا ملے یا نہ ملے، وہ اب پاگل خانے کا کیس ہے۔

اور جب میں نے اسے اپنی کلاس کے ساتھ آگرہ کے پاگل خانے میں بیٹھے دیکھا تو وہ منہ گھٹنوں میں چھپائے ہوئے تھا۔ اس کے بازو اکٹھی کی ہوئی ٹانگوں کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بڑی زور سے قہقہہ لگایا اور اچانک چپ ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا جیسے فضا میں اپنے قہقہے کو ڈھونڈ رہا ہو۔

مزارعہ، موت اور مامتا

تیس سال بعد قتل کا سراغ مل گیا ہے لیکن قاتل کے خلاف اب کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔

۱۹۴۱ء میں مشرقی پنجاب (بھارت) کے ایک گاؤں میں ایک مسلمان جاگیردار کا ایک مزارعہ قتل ہو گیا۔ لاش کھیتوں میں پڑی تھی۔ جاگیردار نے دوسرے گاؤں کے ایک آدمی پر شُبہ کیا۔ اسے پکڑ لیا گیا — شہادتیں قابلِ اعتبار تھیں اس لیے سیشن کورٹ نے اس آدمی کو سزائے موت دے دی۔ اپیل دائر کی گئی جو سماعت کے لیے منظور کر لی گئی۔ پکی پیشی کی تاریخ بہت دیر سے ملی، لیکن اس سے پہلے اس مسلمان جاگیردار کو کسی نے گولی مار کر قتل کر دیا۔

میں اُس وقت پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ یہ میرے تھانے کا کیس تھا۔ جاگیردار کے قتل کا سُراغ نہ مل سکا پھر پاکستان بن گیا۔ مسلمان ملازم پاکستان میں آ گئے۔ چار سال بعد میں ریٹائر ہو گیا۔

پاکستان میں مجھے اُسی چک میں زمین ملی جہاں اس جاگیردار کے گاؤں کے لوگوں کو ملی تھی۔ اس کے قتل کی واردات کو لوگ بھولتے جا رہے تھے۔ جہاں لاکھوں مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے وہاں ایک مزارعہ اور ایک جاگیردار کا قتل کسے یاد رہ سکتا تھا۔ کبھی کبھی گاؤں کے لوگ کسی نئے قتل کی باتیں کرتے تھے تو مجھے جاگیردار کا قتل ضرور یاد آتا تھا اور میں حیران ہوتا تھا کہ ہمارے ہاتھوں کبھی کوئی قاتل بچ کر نہیں نکلا تھا،

اور میں حیران ہوتا تھا کہ ہمارے ہاتھوں کبھی کوئی قاتل بچ کر نہیں نکلا تھا، ہم اسے ضرور پکڑ لیتے تھے۔ عدالت میں جا کر عدم ثبوت یا شک کی بنا پر بری ہو جائے تو یہ اُس کی اپنی قسمت، ہم سُراغ ضرور لگا لیا کرتے تھے۔ میری سروس میں ایک جاگیردار کا ہی قتل تھا جس کا کوئی سُراغ نہ ملا تھا۔

ہمارے چک میں ایک ریٹائرڈ صوبیدار صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ میں نے کئی بار اس قتل کا ذکر کیا تھا۔ وہ بھارت میں اسی گاؤں کے رہنے والے تھے جس گاؤں کے آدمی کو مزارعے کے قتل میں سزائے موت ملی تھی۔ وہ جاگیردار کو اور اس آدمی کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ بھی اکثر حیرت کا اظہار کیا کرتے تھے کہ جاگیردار کا قاتل کون تھا اور یہ بات بھی مشکوک تھی کہ مزارعہ کا قاتل وہی آدمی تھا جسے سیشن کورٹ نے سزائے موت دی تھی۔

پچھلے سال ایک بوڑھی عورت مر گئی۔ ہم جنازے کے ساتھ گئے۔ جب اس بڑھیا کی میّت قبر میں اتاری جا رہی تھی۔ میں اور صوبیدار صاحب ذرا دُور کھڑے تھے۔ صوبیدار صاحب اپنی عادت کے خلاف خاموش تھے۔ وہ تو ہمیشہ باتیں کرتے رہتے تھے۔ جب قبر پر مٹی ڈال دی گئی اور بہشتی قبر پر پانی چھڑکنے لگا تو صوبیدار صاحب نے مجھے کہا ——— "جاگیردار کا قاتل دفن ہو گیا ہے"۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر اُن کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا ———

"اس بہادر عورت نے جاگیردار کو قتل کیا تھا۔ اب بے شک ساری دُنیا کو سُنا دو۔ بندوق میری تھی جس سے اس نے جاگیردار کا خاتمہ کر کے اپنے بیٹے کی سزائے موت کا انتقام لیا تھا"۔

میرا ذہن مجھے تیس سال پیچھے بھارت کے اُس گاؤں میں لے گیا جہاں ہمارے تھانے کا انچارج سب انسپکٹر کرن سنگھ، حوالدار شنکر اور

میں جاگیردار کی رپورٹ پر گئے تھے۔ مزارعے کی لاش کھیتوں میں پڑی تھی۔ کلہاڑی سے اُس کی کھوپڑی کٹی ہوئی تھی، جسم پر کچھ غیر قدرتی نشان تھے۔ لاش کے اردگرد بہت سے آدمی کھڑے تھے جو سب کے سب مزارعے تھے۔ جاگیردار بھی موجود تھا۔ اُس نے چار مزارعوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ واردات سُورج نکلنے سے پہلے ان کے سامنے ہوئی ہے۔ قاتل فلاں گاؤں کا رہنے والا ہے، اُس کا نام احمد ہے (صحیح نام کچھ اور تھا۔ میں یہ نام اس لیے نہیں لکھتا کہ اس خاندان کے لوگ زندہ ہیں)۔

چاروں مزارعوں نے باری باری احمد کا نام لیا اور یہی ایک بیان دیا کہ مقتول ہل چلا رہا تھا۔ احمد آیا اور مقتول کو بلایا۔ یہ مزارعے دوسرے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے مقتول کو احمد کے قریب جاتے دیکھا۔ ان کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں۔ احمد نے کلہاڑی کا وار اس کے سر پر کیا اور بھاگ گیا۔ مقتول گر پڑا۔ مزارعے دوڑ کر پہنچے۔ مقتول مر چکا تھا۔ احمد کو انہوں نے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سب انسپکٹر کرن سنگھ مجھے اور شنکر کو ساتھ لے کر احمد کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ جاگیردار بھی اپنی برادری کے تین چار آدمیوں کے ساتھ ہمارے پیچھے پیچھے آ گیا۔ انہوں نے ہمیں احمد کا گھر دکھایا۔ کرن سنگھ نے دروازے پر دستک دی تو ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ جاگیردار اور اس کے ساتھیوں نے ایک ہی بار کہا ——— "یہ ہے احمد دین"۔

اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور اُس نے کچھ بھی نہ کہا ———

کرن سنگھ نے جب اس سے پوچھا کہ تمہارا نام احمد ہے؟ تو اُس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ زبان سے نہ بول سکا۔ مجھے اور شنکر کو کرن سنگھ نے دروازے پر کھڑا کر دیا اور خود اندر چلا گیا۔ تین چار قدم چل کر رُک گیا اور جاگیردار کے ساتھ جو آدمی آئے تھے ان کو اندر لے گیا۔ گاؤں کے لوگ گلی

میں اکٹھے ہو گئے۔ میں نے اور تنسکر نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔

سب انسپکٹر کرن سنگھ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگا کر باہر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں کپڑے میں لپٹی ہوئی کلہاڑی تھی۔ اس نے ایک کاغذ مجھے دیا۔ یہ کلہاڑی کی برآمدگی کا مشیر نامہ تھا۔ اس پر دو مشیروں کے دستخط تھے۔ یہ دونو آدمی جاگیردار کے ساتھ آئے تھے۔ احمد دین کو کرن سنگھ اپنے ساتھ لے آیا۔

احمد خاندانی زمیندار تھا۔ اُس کی عمر تیس یا بتیس سال تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ گھر میں اس کی ماں اور بیوی اور دو بچے تھے۔ وہ سب باہر آ گئے۔ ماں اور بیوی رو رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بچے بھی رونے لگے۔ احمد نے انہیں بلند آواز سے کہا ——— "حوصلہ کرو، میں نے ڈاکہ نہیں ڈالا، دُعا کرو" ——— پھر اُس نے گاؤں والوں سے کہا ——— "تم سب کو معلوم ہو جائے گا یہ کیا قصّہ ہے"۔

گاؤں کے دو آدمیوں نے کرن سنگھ کو روک لیا اور پوچھا کہ وہ احمد کو کیوں اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ کرن سنگھ کی بجائے جاگیردار نے طعنہ دے کر جواب دیا ——— "جب اس کی لاش پھانسی سے اُتر کر یہاں آئے گی تو تمہیں پتہ چل جائے گا اسے کہاں لے جا رہے ہیں"۔

احمد نے للکار کر کہا ——— "گاؤں والو! غم نہ کرو۔ جو اللہ کرے گا"۔

پھانسی کا نام سُن کر احمد کی ماں دوڑی آئی۔ اُس نے جاگیردار کے منہ پر دونو ہاتھ مار کر کہا ——— "سارا جہان دیکھے گا لاش کس کی آتی ہے۔ میرا دودھ سچا ہُوا تو سارا جہان دیکھے گا"۔

میں نے ان باتوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ ایسی باتیں ہم روزمرّہ سُنا کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کو پرانی دشمنی کی وجہ سے قتل اور زخمی کرتے رہتے تھے اور جب ہم گرفتاری کرنے جاتے تھے تو دونوں فریق ایک دوسرے کو اسی طرح طعنے دیا کرتے تھے، لیکن مجھے معلوم نہیں

تھا کہ یہاں کوئی اور ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ ہم لوگ جو پولیس کے ملازم تھے ہمیشہ یہی کوشش کیا کرتے تھے کہ تفتیش جلدی جلدی مکمل ہو جائے اور مقدمہ قائم کر کے عدالت کے سپرد کر دیں۔ جب اصل ملزم مل جاتا تھا تو ہم ایک دو جھوٹے گواہ شامل کر کے بھی مقدمہ مکمل کر لیا کرتے تھے کیونکہ شہادت کے بغیر ملزم کو سزا نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم یہ ضرور خیال رکھتے تھے کہ کسی بے گناہ کو سزا نہ ہو جائے۔ مقتول اور قاتل کے رشتہ داروں کی طرف سے ہمیں جو "نذر نیاز" ملتی تھی اس سے ہم نے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔

ہم احمد کو تھانے لے گئے۔ لاش تھانے پہنچ گئی تھی۔ ہم تھانے میں داخل ہوئے تو سب انسپکٹر کرن سنگھ کلہاڑی جو کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی، ہاتھ میں اٹھائے اُس کمرے میں چلا گیا جہاں لاش رکھی ہوئی تھی۔ جب وہ کمرے سے نکلا تو وہ کلہاڑی کو کپڑے میں لپیٹ رہا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے اندر جا کر کلہاڑی کپڑے سے نکالی تھی اور اب اسے دوبارہ لپیٹ رہا تھا۔

لاش اور کلہاڑی شہر بھیج دی گئی اور ان کے ساتھ ضروری کاغذات بھی بھیجے گئے۔

ملزم سے پوچھ گچھ شروع ہوئی تو اس نے کہا ——— "میرا مقتول کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بے چارہ مزارع تھا اور میں راجپوت ذات کا مسلمان ہوں۔ میری ایک مزارعے کے ساتھ بھلا کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ ان لوگوں کے ساتھ میرا کوئی کھیت بھی نہیں ملتا، نہ ان کے ساتھ پانی کا جھگڑا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مقتول کون تھا، اس کا نام کیا تھا اور اس کی عمر کتنی تھی"۔

"تمہارے خلاف شہادت مکمل ہے"۔ کرن سنگھ نے ہنس کر کہا۔ "اقبال جرم نہیں کرو گے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ چوہدری صاحب (جاگیردار

نے تم پر کیوں شک کیا ہے اور چار آدمیوں نے کیوں کہا ہے کہ انہوں
نے تمہیں مزارعے کے سر پر کلہاڑی مار کر بھاگتے دیکھا ہے"؟
"چوہدری میرا دشمن ہے"۔ ملزم نے جواب دیا۔
"کیا دُشمنی ہے"؟ ۔ کرن سنگھ نے پوچھا۔
"یہ نہیں بتاؤں گا"۔ ملزم نے جواب دیا۔
"نہ بتاؤ"۔ کرن سنگھ نے کہا ——— "تم نے دُشمنی کا نام لے کر اپنے خلاف
یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم قاتل ہو۔ قتل کی وجہ تم نے خود بتا دی ہے"۔
ملزم نے یہ سُنا تو مُسکرانے لگا۔ شنکر نے پیچھے سے اس کی کمر میں لات
ماری اور گالی دے کر کہا ——— "..... ہنستا ہے"۔
ملزم فرش پر بیٹھا تھا۔ لات لگی تو وہ منہ کے بل جا پڑا۔ وہاں سے
بہت تیزی سے اُٹھا اور شنکر کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ شنکر آگے کو دوہرا
ہُوا تو ملزم نے اس کے مُنہ پر اس قدر زور سے گھونسا مارا کہ شنکر زمین سے
اُٹھا اور پیچھے دیوار سے جا لگا۔ وہ گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ ملزم نے
کرن سنگھ کی طرف قہر سے دیکھا اور کہا ——— "اگر کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا
تو یاد رکھ تھانیدارا، تیرا ایک ایک بچہ قتل ہو جائے گا ..... لکھ لو کہ میں
نے قتل کیا ہے۔ میں نے اس کے سر پر کلہاڑی ماری تھی"۔
میں حیران ہوں کہ کرن سنگھ بڑا ظالم تھانیدار تھا۔ وہ بیٹھا کیوں رہا؟
ملزم احمد دراصل عام قسم کا دیہاتی نہیں تھا۔ زمین جائداد والا آدمی تھا۔
اُس کا جسم بہت مضبوط اور خوب صورت تھا اور اس کے چہرے پر جلال
تھا۔ شنکر کو بے ہوش کر کے اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں جلتے
ہوئے کوئلے بن گئی تھیں۔ اُس کی آواز میں شہزادوں والا رعب اور دبدبہ
تھا۔ سب انسپکٹر کرن سنگھ نے ہیڈ کانسٹیبل شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ اُٹھ رہا
تھا۔ اُس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اٹھا تو کمرے کے ایک کونے

کی طرف دوڑا، وہاں ایک ہتھکڑی پڑی تھی۔ اُس نے ہتھکڑی اُٹھا لی
اور اُس کی زنجیر کو دوہرا کر کے احمد کو مارنے کے لیے دوڑا۔
کرن سنگھ نے کُرسی سے اُٹھ کر اسے روک لیا اور غصے سے کہا
——— "خبردار، تمہیں کس نے کہا تھا کہ اسے مارو؟ تفتیش میں کر رہا ہوں
یا تم؟ نکل جاؤ باہر۔ دو گھونسے کھا کر ہوش نہیں رہی تو اپنی ماں کے خصم
کو زنجیر سے مارنے دوڑتا ہے"۔
شنکر باہر نکل گیا تو کرن سنگھ نے مجھے کہا کہ ملزم کو حوالات میں بند کر دو،
پھر ملزم سے کہا ——— "تم پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھائے گا احمد، ناراض نہ ہونا۔
میں نے اس کنجر کی اولاد کو نہیں کہا تھا کہ تمہیں مارے۔ تم حوالات میں جاؤ
اور اپنے بیوی بچوں کے حال پر رحم کر کے سوچو۔ اگر دُشمنی کی وجہ بتا دو گے
تو بابا نانک کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ پھانسی نہیں چڑھنے دُوں گا"۔
"سردار جی"۔ ملزم نے جواب دیا۔ "پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دو،
دُشمنی کی وجہ نہیں بتاؤں گا"۔
اُسے حوالات میں بند کر کے میں کرن سنگھ کے پاس گیا تو اُس نے
میرے ساتھ رازداری سے باتیں شروع کر دیں۔ مجھ پر اسے بہت بھروسہ تھا۔
اُس نے کہا ——— "نادرے! اس علاقے میں صرف ہندو ہوتے تو ہم
بڑے مزے میں نوکری کرتے۔ سکھوں اور مسلمانوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔
قتل کی آٹھ وارداتیں سکھوں کی ہیں اور چھ مسلمانوں کی۔ چھ وہ قتل ہمارے سر
پر پڑے ہیں۔ شہادتیں پوری نہیں ہو رہیں۔ دس وارداتیں ڈاکے کی درج
ہیں اور باقی چھوٹے موٹے کیس دیکھ لو۔ اب یہ واردات آ گئی ہے۔ تمہارا
شک پکا نہیں کہ قاتل احمد ہی ہے"؟
"موقع کے چار گواہ صاف گواہی دے رہے ہیں"۔ میں نے جواب دیا
——— "آلۂ قتل آپ نے برآمد کیا ہے۔ میں نے تو نہیں دیکھا کہ اس پر
کوئی داغ دھبہ تھا"۔

"کلہاڑی شیشے کی طرح چمک رہی تھی"۔ کرن سنگھ نے کہا ——
"ہاں ..... نادرے ! تم میرے یار ہو۔ تم نے ہمیشہ میری عزت رکھی ہے۔
ایک بات دل میں رکھ لو۔ میں نے کلہاڑی کا پھل لاش کے زخم میں ڈال کر ذرا کھوپڑی میں رگڑا تھا، پھر لاش کی کھلی ہوئی کھوپڑی میں سے پانچ بال کلہاڑی کے ساتھ چپکا دیئے تھے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ میں کمرے میں لاش دیکھنے گیا تھا تو کلہاڑی ساتھ لے گیا تھا۔ کلہاڑی کے ساتھ مغز کے چھوٹے چھوٹے دو تین ٹکڑے چپک گئے تھے۔ میں نے کلہاڑی لاش کے ساتھ شہر بھیج دی ہے۔ میں نے کلہاڑی کی برآمدگی کے مشیر نامے پر بھی چوہدری کے گاؤں کے آدمیوں کے انگوٹھے لگوائے ہیں۔ میں نے وہاں سے واپس آتے راستے میں چوہدری کو بتا دیا تھا کہ عدالت میں دونو مشیر یہ گواہی دیں کہ جب کلہاڑی برآمد ہوئی تو اس کے پھل کے ساتھ خون اور بال تھے"۔

میں بھی تو پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ مجھے شک ہوا کہ کرن سنگھ کی جیب جاگیردار نے گرم کر دی ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ خالصہ جی، ہم بھی بال بچے دار ہیں۔ تنخواہ میں کہاں گذر ہوتی ہے۔ آپ حصہ دیتے ہیں تو بچے پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔

کرن سنگھ نے بابا نانک کی قسم کھا کر کہا ——"ایک پائی حرام ہے نادرے ! میں نے ابھی کوئی سودا نہیں کیا۔ میں نے یہ کاریگری اس واسطے کی ہے کہ چودہ قتل اور دس ڈاکے پہلے ہی ہماری جان کھا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ملزم احمد قاتل ہے لیکن استغاثہ کمزور رہ جائے گا اور کیس سزا ہونے سے رہ جائے گا۔ شہادت پکّی کرنے کے لیے میں نے کلہاڑی کو لاش کی کٹی ہوئی کھوپڑی میں رگڑا تھا۔ کیس بالکل صاف تھا مگر ملزم نے یہ کہہ کر کنٹا ڈال دیا ہے کہ چوہدری کے ساتھ اس کی کوئی دشمنی ہے۔ ملزم یہ نہیں بتا رہا کہ دشمنی کیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ عدالت میں جا کر یہ ثابت کر دے گا کہ اس نے مقتول کو حفاظتِ خود اختیاری میں مارا ہے۔

ہمیں دشمنی کی وجہ معلوم کرنی پڑے گی اور تم جانتے ہو نادر کہ قتل کی وجہ بتائے بغیر استغاثہ کتنا کچا ہو گا"۔

کرن سنگھ گالی ماں بہن کی دیا کرتا اور قسم بابا نانک کی کھایا کرتا تھا۔ جب وہ جھوٹ بولتا تھا تو گالیاں زیادہ دیتا اور بابا نانک کے ساتھ گوردارجن اور گورد گوبند سنگھ کی قسمیں بھی کھایا کرتا تھا اور جب سچ بولتا تھا تو صرف بابا نانک کی قسم کھاتا تھا۔ میرا یہ شک رفع ہو گیا کہ جاگیردار نے اس کی مٹھی گرم کی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کرن سنگھ تفتیش کو قریب ہی سے گول کر کے مقدمہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن قتل کی وجہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔ ایک کھاتے پیتے زمیندار نے دوسرے گاؤں کے ایک غریب مزارعے کو جا کر قتل کر دیا تو کیوں کر دیا؟ ہم صفائی کے وکیلوں کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور احمد پیسے والا زمیندار تھا۔ وہ کوئی معمولی سا وکیل کرنے والا آدمی نہیں تھا چنانچہ ہم نے مخبر چھوڑے اور خود مقتول کے گھر چلے گئے۔

رات ہو گئی تھی۔ مقتول کے گھر عورتیں جمع تھیں۔ ماتم ہو رہا تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے گئی تھی۔ باہر مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ کرن سنگھ اور میں بھی مردوں میں بیٹھ گئے۔ کرن سنگھ نے سب سے پوچھا کہ ملزم اور مقتول کی یا چوہدری اور ملزم کی دشمنی کیا تھی۔ سب چپ ہو گئے۔ بار بار پوچھا تو تین چار آدمیوں نے جواب دیئے، لیکن کوئی کام کی بات نہ نکل سکی۔ میں نے دیکھا کہ وہ سب ڈرے ہوئے تھے، بات کھل کر نہیں کرتے تھے۔

آخر ایک بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا ——"بادشاہوں کی دشمنیوں کو ہم کیا جانیں۔ ہم غریب مزارعے ہیں۔ دشمنی ہو گی تو زمینداروں کی ہو گی۔ مارا گیا تو ہمارا آدمی مارا گیا"۔

موقع کے چاروں گواہ وہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے وہی باتیں دہرا دیں جو وہ صبح بتا چکے تھے۔

ہم وہاں سے اٹھے اور مقتول کی بیوی کو باہر بلایا۔ بے چاری کا برا

سال تھا۔ اُس نے سر دوپٹے سے باندھ رکھا تھا اور بَین کر کر کے رو رہی تھی۔ بہت مشکل سے اُسے تسلّی دلاسا دیا اور پوچھا کہ ملزم کے ساتھ ان کی کیا دُشمنی تھی۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کر کہا ——"اللہ انصاف کرے گا، ہماری کسی کے ساتھ دُشمنی نہیں تھی۔ میرے سر کا سائیں تو چھ روز پہلے ہی سر سے اُٹھ گیا تھا۔ آج ساتویں روز پتہ چلا کہ کھیتوں میں اس کی لاش پڑی ہے۔"

"چھ روز پہلے سر سے اُٹھ گیا تھا؟"۔ کرن سنگھ نے حیران ہو کر پُوچھا ——"اچھی طرح بتاؤ بی بی! وہ کہاں چلا گیا تھا؟"

"چھ روز گزرے اسے رات کے وقت کوئی بلانے آیا تھا"—— مقتول کی بیوی روتے روتے کہنے لگی ——"وہ باہر نکلا پھر واپس نہیں آیا۔ آج صبح ....." اور وہ پھر اپنا سینہ پیٹنے لگی۔

ہم وہاں سے آ گئے۔ مسئلہ اور ٹیڑھا ہو گیا۔

ہم نے ملزم کا سات روز کا ریمانڈ لیا تھا۔ پورے سات روز ملزم نے اس کے سوا کوئی اور بات نہ کی کہ دُشمنی نہیں بتاؤں گا کہ کیا تھی۔ مخبر بھی کوئی کام کی بات نہیں بتا رہے تھے۔ انہوں نے یہ بتایا کہ وہ سب مزارعوں کے خاندان ہیں، چوہدری کا دیا کھاتے ہیں اور اس کے غلام ہیں۔ وہ ڈرتے کوئی بات نہیں کرتے۔ اگر کوئی آدمی ایسی بات کرتا ہے تو دُوسرا اُس کے بالکل اُلٹ بات کر دیتا ہے۔

ریمانڈ ختم ہُوا تو سات روز کا ایک اور ریمانڈ لے لیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ چکی تھی اور پانچویں روز کلہاڑی کے متعلق بھی رپورٹ آ گئی۔ اس سے ہمیں حوصلہ ہُوا کہ عدالت میں کیس ہمیں خراب نہیں کرے گا۔ ایگزامینر نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ کلہاڑی قتل کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ مغز کے ٹکڑے مقتول کے ہیں اور کلہاڑی کے پھل پر چپکے ہوئے پانچ بال جن میں تین سفید اور دو کالے ہیں، مقتول کے بالوں سے سو فیصد ملتے ہیں

—— مگر قتل کی وجہ؟ دُشمنی کیا تھی؟ مقتول قتل ہونے سے چھ روز پہلے کہاں رہا؟ کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

قتل کے بارہویں روز کرن سنگھ مجھے ساتھ لے کر مقتول کے گھر گیا۔ دن کا وقت تھا۔ ہم دروازے پر دستک دیئے بغیر اندر چلے گئے۔ مقتول کی بیوہ کمرے میں اکیلی بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس کے سامنے ایک ٹرنک کھُلا پڑا تھا۔ وہ کپڑے کھول کر دیکھتی اور روتی تھی۔ کپڑے زنانہ تھے اور بالکل نئے۔ اُس نے ایک سُرخ جوڑا کھول کر رکھا ہُوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ گھبرا گئی اور ٹرنک بند کرنے لگی۔

"یہ کپڑے کس کے ہیں؟" —— کرن سنگھ نے پُوچھا۔ وہ چُپ رہی اور ہمیں محسوس ہُوا کہ وہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"یہ تو شادی کے جوڑے ہیں"۔ مَیں نے پُوچھا۔ "کس کے ہیں"؟

اس نے ہکلا کر کہا —— "میری اپنی شادی کے وقت کے ہیں"۔

"تمہاری شادی ہوئے کم سے کم بیس سال ہو گئے ہیں" —— کرن سنگھ نے کہا۔ "یہ کپڑے بیس سال پرانے نہیں۔ یہ بالکل نئے ہیں" —— کرن سنگھ نے ذرا رُعب سے پوچھا تو وہ رو پڑی۔

روتے روتے اُس کے مُنہ سے بَین نکل گیا —— "اب تو یہ بھی ٹرنک میں ہی پڑے پڑے پُرانے ہو جائیں گے۔ جس کے لیے بنائے تھے وہ تو ایک ہی جوڑے میں چلی گئی ہے"۔

"کون ہے وہ"؟۔ کرن سنگھ نے پُوچھا۔

"میری بیٹی"۔ اُس نے جواب دیا۔

"کہاں چلی گئی ہے"؟ کرن سنگھ نے پُوچھا۔

"یہ مت پوچھو۔ یہ مت پوچھو"۔ وہ اور زیادہ رونے لگی۔

اتنے میں جاگیردار آ گیا اور کرن سنگھ سے بغل گیر ہو کر ملا پھر مجھ سے بغل گیر ہُوا۔ کہنے لگا —— "کسی نے ابھی ابھی خبر دی ہے کہ آپ آئے

ہیں ۔مجھے اطلاع دیتے تو گھوڑے تھانے میں بھیج دیتا ۔"

کرن سنگھ نے ایک بار پھر مقتول کی بیوہ سے پوچھا ——— "کہاں چلی گئی ہے تمہاری بیٹی" ؟

بیوہ نے جواب دینے کی بجائے جاگیر دار کی طرف دیکھا ۔جاگیر دار نے کرن سنگھ سے کہا ——— "دراصل جی یہ بات میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس کتنا کام ہوتا ہے ۔ قتل کا کیس بالکل صاف ہے ۔ گواہ موجود ہیں ۔ دراصل قتل کی اصل وجہ یہی لڑکی تھی ۔ ملزم احمد کبھی کبھی اِدھر سے گزرا کرتا تھا ۔ اُس نے مقتول کی بیٹی کو دیکھ لیا تھا اور اس کے پیچھے پڑا ہُوا تھا ۔مقتول نے مجھے دو تین بار بتایا تھا اور میں نے ایک روز احمد کو خبردار کیا تھا کہ وہ آئندہ اِدھر سے نہ گزرے اور لڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے ۔ پھر ایک روز مقتول کے قتل کی اطلاع ملی اور یہ بھی پتہ چلا کہ لڑکی غائب ہے" ——— جاگیر دار نے مقتول کی بیوہ سے پوچھا ——— "کیوں نوراں ، ایسے ہی ہُوا تھا نا" ؟

"جی ، ایسے ہی ہُوا تھا" نوراں نے سر ہلا کر کہا ۔

"آپ نے یہ بات اپنے بیان میں کیوں نہیں لکھوائی" ؟ ——— میں نے جاگیر دار سے پوچھا ۔

"اس لیے نہیں لکھوائی کہ لڑکی کو برآمد کرنا یا یہ ثابت کرنا کہ اسے ملزم احمد نے اغوا کیا ہے آپ کے لیے بہت مشکل ہوگا" ——— جاگیر دار نے جواب دیا ——— "اور فرض کریں کہ لڑکی مِل جاتی ہے اور وہ عدالت میں کہہ دیتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی یا یہ کہہ دے کہ وہ ملزم احمد کے ساتھ گئی ہی نہیں تو آپ کی اور ہماری کیا عزت رہ جاتی ہے ؟ لڑکی جوان ہے اور حرامزادی بڑی منہ پھٹ ہے ، اصل بے حیا" !

کرن سنگھ چُپ ہو گیا ۔ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ لڑکی کی گمشدگی

کا قتل کے ساتھ گہرا تعلق ہے ۔ جاگیر دار ہمیں وہاں سے اُٹھا کر اپنے گھر لے گیا ۔ اُس نے پانچ سَو روپے ہمارے سامنے رکھ کر کہا ——— "مقتول مزارعہ تھا ۔ مزارعے مرتے ہی رہتے ہیں لیکن اس واردات کو مَیں اپنی بے عزتی سمجھ رہا ہوں ۔ ایک تو میرے علاقے سے لڑکی چلی گئی اور اس پر یہ ظلم کہ لڑکی کا باپ قتل ہوگیا ۔ میری پگڑی تو بے عزت ہو گئی نا سرار جی ! ملزم بری نہیں ہونا چاہیئے ۔ آپ لڑکی کے چکر میں نہ پڑیں ورنہ کیس چوپٹ ہو جائے گا ۔"

کرن سنگھ نے پانچ سو روپیہ اُس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا ——— "چوہدری جی، مَیں نے استغاثہ مضبوط کرنے کے لیے جو کیا وہ کوئی اور انسپکٹر نہیں کر سکتا ۔ اب آپ ہم سے لڑکی کی گمشدگی گول کرانا چاہتے ہیں ۔اس کے لیے پانچ سَو تو بہت تھوڑے ہیں ۔پانچ ہزار کی بات کریں" ——— کرن سنگھ سمجھ گیا تھا کہ لڑکی کے ساتھ جاگیر دار کا تعلق ضرور ہے ورنہ ایک مزارعے کے قتل میں کون جاگیر دار اتنی دلچسپی لیتا اور اپنے پلّے سے رقم دیتا ہے ۔ کرن سنگھ نے کہا ——— "لڑکی کی برآمدگی کیس میں بہت ضروری ہے ۔ کیوں نادرے" !

"کیوں نہیں جی" ۔ مَیں نے کہا ——— "اگر عدالت میں مُلزم نے صفائی میں لڑکی کو پیش کر دیا تو آپ کیا کریں گے" ؟

کرن سنگھ بولا ——— "نہ چوہدری جی ، مَیں ایسا خطرہ تو کبھی سر پہ نہیں لُوں گا ..... نادرے ! جا بھائی ، مقتول کی بیوہ کو لے آ ۔ اسے تھانے لے چلتے ہیں ۔یہی تو واردات کی جڑ ہے" ۔

چوہدری اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا ۔ کرن سنگھ نے مجھے کہا ——— "دو ہزار دے دے تو بھی ٹھیک ہے ۔اگر تھوڑے دے تو اسے اسی طرح ڈراتے رہنا" ۔

اتنے میں جاگیردار ہاتھ میں نوٹ اٹھائے آ گیا۔ اُس نے نوٹ کرن سنگھ کے آگے رکھے ہُوئے پانچسو کے نوٹوں پر رکھ دیئیے اور ہاتھ جوڑ کر بولا ——"اڑھائی ہزار ہیں"—— اور اس نے کرن سنگھ کی داڑھی چھُو کر میری ٹھوڑی کو چھُوا۔

کرن سنگھ نے سارے نوٹ میرے ہاتھ میں دے کر کہا —— "لے بھائی، تجھے منظور ہے تو یہ رقم تُو رکھ لے"۔

مَیں نے اسے کہا —— "انسپکٹر صاحب، یہ لوگ آخر میرے مسلمان بھائی ہیں۔ رکھ لیں ان کی عزت رہ جائے"۔

"ہماری چاہے نوکری چلی جائے"۔ کرن سنگھ نے کہا۔

"اللہ مالک ہے"۔ میں نے کہا اور رقم اپنی جیب میں ڈال لی۔

ہم وہاں سے تھانے چلے گئے۔ اب یہ امید تھی کہ ملزم کی طرف سے بھی کوئی نذرانہ آئے گا لیکن کسی نے بات نہ پوچھی۔ ہم نے ملزم سے لڑکی کے متعلق پوچھا تو اُس نے ہنس کر جواب دیا —— "اللہ بہتر جانتا ہے"۔

اُسے ہم نے لالچ بھی دیئیے لیکن اس نے وہی جواب دیا۔ کرن سنگھ نے اس کی منت کی اور پوچھا کہ لڑکی کہاں ہے اور کیا اسے وہ عدالت میں پیش کرے گا؟ کرن سنگھ نے اُسے یقین دلا دیا کہ وہ لڑکی کی برآمدگی کو گول کر رہا ہے۔

ملزم نے جواب دیا —— "سارا فساد اسی لڑکی کی خاطر ہو رہا ہے۔ مَیں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ لڑکی کا عدالت میں نام تک نہیں لوں گا۔ اگر میں لڑکی کو کچہری چڑھا دوں تو پھر تمہیں دُشمنی کی ساری بات ہی کیوں نہ بتا دُوں؟ یہ لڑکی میری اپنی عزت ہے۔ اِسے میں نے اس شیطان چوہدری کی بدکاری سے بچایا ہے۔ مزارعوں کی کوئی جوان لڑکی اس چوہدری سے بچی ہوئی نہیں۔ اس ایک لڑکی کو مَیں نے بچایا ہے۔ وہ بہت دُور چلی گئی ہے۔ مَیں اسے

کچہری چڑھا کر بے عزت نہیں کروں گا"۔

ہمیں اطمینان ہو گیا کہ استغاثہ اس خطرے سے محفوظ رہے گا۔ کرن سنگھ نے سات سو روپے مجھے دیئیے اور اٹھارہ سو اپنے پاس رکھے۔ کہنے لگا کہیں گڑبڑ ہو گئی تو باقی رقم سے اسے ختم کریں گے۔ ہم نے مقدمہ قائم کیا۔ گواہوں کو تھانے بُلا کر بیان رٹا دیئیے۔ مجسٹریٹ سے شناخت پریڈ بھی کرا دی اور اپنی عقل اور تجربے کے مطابق استغاثہ میں کوئی نقص نہ رہنے دیا۔

مجسٹریٹ کی عدالت میں ملزم نے اقبالِ جرم سے انکار کیا اور صفائی میں صرف اس قسم کے گواہ گزارے کہ قتل کا جو وقت بتایا گیا ہے اُس وقت ملزم گھر میں سویا ہُوا تھا۔ صفائی کے وکیل نے بڑی اچھی طرح جرح کی۔ مجسٹریٹ نے مقدمہ سیشن سپرد کر دیا۔ وہاں سے ملزم کو سزائے موت سُنا دی گئی۔ ملزم کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی جو پکی پیشی کے لیے منظور ہو گئی، لیکن پکی پیشی کی تاریخ نہ نکلی۔ تین مہینے گزر گئے، پھر چار مہینے گزر گئے۔

ایک روز جاگیردار سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا ——"پورا سال پکی پیشی نہیں ہونے دوں گا"—— اس کی زبانی یہ بھی پتہ چلا کہ اس نے ملزم کے رشتہ داروں کو بھی للکار کر کہا ہے کہ ہمت ہے تو پکی پیشی کی تاریخ ایک سال کے اندر نکلوا لو۔ جاگیردار نے وہاں بھی نذرانہ دے رکھا تھا اس لیے تاریخ نہیں نکل رہی تھی۔

چھٹا مہینہ گذر رہا تھا کہ رات کے وقت ہمیں رپورٹ ملی کہ جاگیردار کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ کرن سنگھ کے ساتھ میں گیا۔ دو کانسٹیبل بھی ساتھ تھے۔ جاگیردار کی لاش اُس کے صحن میں چارپائی پر پڑی تھی اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ قاتل کا کوئی کھُرا کھوج نہیں تھا، نہ کسی کو معلوم ہو سکا کہ قاتل کون تھا۔

ابھی تو کسی کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ جاگیردار کو گولی ماری گئی ہے۔

ہم نے لاش دیکھی۔ گولی ایک پہلو سے گزر کر دوسرے پہلو سے نکلی تھی۔ گاؤں کے کسی ایک آدمی نے بھی گولی کی آواز نہیں سُنی۔ وجہ یہ تھی کہ مقتول کے بھتیجے کی شادی ہو رہی تھی۔ بارات اگلی صبح جا رہی تھی۔ رات کے وقت گاؤں میں بھانڈ آئے ہوئے تھے اور بے بہا آتش بازی چل رہی تھی۔ آتش بازی میں بڑے گولے زیادہ تھے۔ لوگ بھانڈوں کا تماشا دیکھ رہے تھے اور کچھ آدمی گولے چلا رہے تھے۔ ایک ایک بار پانچ پانچ چھ چھ گولے پھٹتے تھے۔ گولے چلانے والے گولوں کو آگ لگا کر اوپر پھینکتے تھے۔

ان دھماکوں میں کسی نے شور مچا دیا۔ "چوہدری صاحب زخمی ہو گئے ہیں۔ اِدھر آؤ، دوڑو۔" لوگ چودھری کو اٹھانے دوڑے لیکن وہ مر چکا تھا اور خون ہی خون بہہ رہا تھا۔ اُٹھا کر اُس کے گھر چارپائی پر ڈالا۔ گھر والوں نے زخم دیکھے لیکن سمجھ نہ سکے کہ اسے کس ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے۔ یہ تو ہم نے جا کر زخم دیکھے اور بتایا کہ اسے گولی ماری گئی ہے۔ ہر کوئی حیران ہو گیا کہ گولی کس نے چلائی، کس وقت چلائی اور کہاں سے چلائی؟ ہمارے پوچھنے پر ہمیں بتایا گیا کہ ہوا میں گولے پھٹ رہے تھے۔ بندوق کے دھماکے کو یہ کمبخت لوگ گولے کا دھماکہ سمجھتے رہے۔ قاتل بہت ہی چالاک اور ہوشیار تھا جس نے گولوں سے آواز ملا کر گولی چلائی تھی۔

ہم نے تفتیش شروع کر دی۔ گاؤں میں تین دو نالی اور دو ایک نالی بندوقیں ہمارے ریکارڈ پر تھیں۔ وہ نکلوائیں اور ٹیسٹ کے لیے بھجوانے کا انتظام کیا۔ جتنے آدمیوں کو شاملِ تفتیش کیا جا سکتا تھا، کیا۔ شک احمد کے رشتہ داروں پر بھی ہوتا تھا۔ اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ جاگیردار کو احمد کے کسی رشتے دار نے انتقامی جذبے سے گولی مار دی ہو گی۔ وہاں گئے۔ وہاں ہم تیسرے روز گئے۔ وہاں چار بندوقیں تھیں۔ وہ تھانے میں

جمع کرا لیں۔ مخبروں کو علاقے میں پھیلا دیا۔

چھ سات دنوں بعد ایکسپرٹ کی رپورٹ ملی کہ ان میں سے کسی بندوق میں سے گولی نہیں نکلی۔ ساری بندوقیں واپس آ گئیں۔ ہم نے گاؤں میں خالی کارتوس بہت تلاش کیا تھا، لیکن نہیں مل سکا تھا۔ خالی کارتوس بندوق کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔

اس کے بعد تفتیش اور سراغ رسانی کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہماری نیندیں حرام ہو گئیں۔ ایک انگریز ڈی۔ ایس۔ پی دورے پر آیا تو اس کمبخت نے بھی اسی کیس کی فائل نکلوالی۔ واردات تین مہینے پرانی ہو چکی تھی۔ انگریز نے سوالوں پر سوال کر کے کرن سنگھ کو اور مجھے پریشان کر دیا۔ پھر اسی کیس نے کرن سنگھ کو اور مجھے لائن حاضر کرا دیا۔ ڈپٹی صاحب نے رپورٹ لکھی تھی کہ ہم نے دانستہ سُستی کی ہے اور تفتیش کی جو لائن ہم نے اختیار کی تھی بالکل غلط تھی لیکن اگست ۱۹۴۷ء تک قاتل کا سراغ نہ مل سکا۔ اس عرصے میں تین تھانیدار آئے اور گئے۔

جاگیردار کے قتل کے چوتھے روز سزائے موت کے خلاف احمد کی اپیل کی پکی پیشی ہو گئی۔ اُس نے اپیل کے لیے وکیل نیا رکھا تھا۔ جس روز اس وکیل کی بحث تھی، میں دلچسپی کی خاطر ہائی کورٹ میں چلا گیا۔ وکیل جگدیش نام کا ہندو تھا۔ جج انگریز تھا۔ جرح انگریزی میں کی گئی تھی۔ میں نے اپنے ایک ملنے والے سے بعد میں اس کا ترجمہ سُنا تھا۔ اس وکیل نے موقع کے گواہوں کے بیانات پر بحث کی اور ثابت کر دیا کہ ان میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہے جو بہت ہی غور کرنے سے سامنے آ سکتا ہے۔

اس کے بعد اُس نے صرف ڈاکٹر کی رپورٹ کو سامنے رکھا۔ اس رپورٹ میں جسم کے ہر ایک نشان کا ذکر تھا۔ وکیل نے رپورٹ پڑھ کر کورٹ کو سنائی۔ اس میں لکھا تھا کہ نیلے نیلے نشان دونوں کلائیوں کے

گرد تھے۔ ان لکیروں میں خون جما ہوا تھا۔ پیٹھ پر لمبی لکیریں تھیں جیسے بید کی ضربیں۔ لاش کے معدے کے متعلق ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ خالی تھا اور عام سائز کی نسبت سکڑا ہوا تھا۔

وکیل نے رپورٹ کے انہی حصوں پر بحث کی اور کہا کہ کلائیوں پر جو نشان ہیں وہ بلاشک و شبہ رسیوں کے نشان ہیں۔ مقتول کی کلائیاں رسیوں سے بندھی رہی ہیں اور پیٹھ پر لمبی لکیریں چھڑی، ہنٹر یا بید کی ہو سکتی ہیں اور معدہ خالی تھا۔ معدے کا سکڑنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقتول مرنے سے کئی دن پہلے سے بھوکا رہا ہے۔ وکیل نے ڈاکٹری کی دو کتابیں نکالیں اور معدے کے متعلق پڑھ کر جج کو سنایا اور کہا کہ کلائیوں اور پیٹھ کی لکیریں یہ کہانی سناتی ہیں کہ مقتول کو رسیوں سے باندھ کر چھڑی یا اسی قسم کی کسی چیز سے پیٹا جاتا رہا ہے اور معدے کی حالت ثابت کرتی ہے کہ اسے کئی دن بھوکا رکھا گیا تھا۔ موقع کے تمام گواہوں نے کہا ہے کہ اپیل کنندہ نے مقتول کو سر پر کلہاڑی ماری۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ اپیل کنندہ نے مقتول کو پہلے رسیوں سے باندھا، پھر بید وغیرہ سے پیٹا، پھر کلہاڑی سے اس کا سر کھول دیا۔

ڈاکٹر نے موت کا وقت نصف شب بتایا ہے جب کہ موقع کے گواہ صبح کا وقت بتا رہے ہیں یعنی سحر اور سورج طلوع ہونے کے درمیان کا ایسا وقت جب عینی شاہد چالیس پچاس گز کے فاصلے سے مقتول کو قتل ہوتا دیکھ سکتے تھے۔ نصف شب کا مطلب بارہ بجے ہوتا ہے۔ اسے ایک بلکہ دو بجے کہہ لیجئے لیکن موقع کے گواہ اور پولیس کی ابتدائی رپورٹ قتل کا وقت ساڑھے چھ بجے بتا رہی ہے۔

قتل کا باعث کیا تھا؟ کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ کوئی دشمنی؟ کوئی اشتعال؟ کوئی انگیخت؟ ــــ کیس میں کوئی ذکر نہیں۔ وکیل نے فائل الگ رکھ کر

جج سے کہا:

"مائی لارڈ! رپورٹ درج کرانے والا ایک جاگیردار ہے اور موقعہ کے گواہ اس کے مزارعے ہیں۔ مقتول مزارعہ تھا، مشیر جاگیردار کے رشتہ دار ہیں۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ جاگیردار اپنی جاگیر کا بادشاہ ہوتا ہے مزارعوں کی عزت اس کے قدموں میں ہوتی ہے۔ جاگیرداری میں بڑے بڑے پراسرار واقعات ہوتے ہیں۔ یہ قتل ان میں سے ایک ہے۔ مقتول کو جاگیردار نے اپنی قید میں رکھا۔ اس کے ہاتھ رسیوں سے باندھ کر رکھے۔ اسے بھوکا رکھا۔ جب وہ مرنے کے قریب پہنچا تو اسے آدھی رات کے وقت کھیتوں میں لے جا کر سر میں کلہاڑی مار کر قتل کر دیا۔ یہ قتل جاگیردار کی جاگیر میں ہوا ہے، اپیل کنندہ کے کھیتوں میں نہیں ہوا۔"

وکیل نے مزید کہا ــــ "مائی لارڈ! ریاستوں اور جاگیروں کے مزارعے بھوکے ہی رہتے ہیں لیکن اتنے بھوکے نہیں کہ ان کے معدے خالی ہو کر سکڑ جائیں۔ یہ لوگ مکئی کے چند دانے منہ میں پھینک کر اپنے معدے کے قدرتی سائز کو قائم رکھتے اور جاگیرداروں کے گودام دانوں سے بھرتے رہتے ہیں۔ مقتول کا معدہ بتاتا ہے کہ اسے کئی روز تک بھوکا رکھا گیا اور باندھ کر قید میں رکھا گیا۔ یہ کارستانی جاگیردار کی ہے۔ اس راز سے صرف ایک گواہ نے پردہ اٹھایا ہے جس کی طرف سیشن جج نے توجہ نہیں دی۔ وکیل صفائی نے اس گواہ سے پوچھا کہ مقتول کی اولاد کتنی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ صرف ایک لڑکی ہے۔ اب آپ یہ جرح سنیئے:

(وکیل نے فائل میں سے جرح پڑھ کر سنائی)۔

"لڑکی کی عمر کتنی ہے؟"

"اکیس بائیس سال۔"

"شکل صورت کیسی ہے"؟

"بہت شکل دار ہے"۔

"جاگیردار کے گھر جاتی ہوگی"؟

"میں نے دو دفعہ جاگیردار کے گھر سے اسے نکلتے دیکھا ہے"۔

"تم جاگیردار کے گھر کام کرتے ہو"؟

"جی، مَیں اُن کا خاص ملازم ہُوں"۔

"مقتول کبھی جاگیردار کے گھر گیا تھا"؟

"قتل ہونے سے سات آٹھ روز پہلے مَیں اُسے بُلانے گیا تھا۔ چوہدری صاحب نے اُسے بلایا تھا"۔

"وہ آگیا تھا"؟

"جی"۔

"واپس کب گیا تھا"؟

گواہ گھبرا گیا اور اُس کی زبان ہکلانے لگی۔ بڑی مشکل سے رُک رُک کر اس نے جواب دیا۔ "میں نے اُسے واپس جاتے نہیں دیکھا تھا"۔

"پھر اِسے کتنے دنوں بعد دیکھا"؟

"جب وہ قتل ہو چکا تھا"۔

وکیل نے کہا ——— "یہ ہے قتل کی اصل کہانی۔ قاتل جاگیردار ہے۔ اپیل کنندہ کو اس نے کیوں پکڑوایا؟ اس کا کیا تعلق تھا؟ دشمنی کیا تھی؟ قتل کی تحریک کیا تھی؟ مقدمے کی فائل کچھ نہیں بتاتی۔ استغاثہ اِس معاملے میں خاموش ہے"۔

جج نے ڈاکٹر کی رپورٹ پڑھی اور احمد کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔

ہندو وکیل نے احمد کو پھانسی کے تختے سے اتار لیا، اُس وقت سب

انسپکٹر کرن سنگھ جاگیردار کے قتل کی تفتیش میں کوتاہی کرنے کی پاداش میں لائن حاضر ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ایک ہندو تھانیدار بھی آیا اور کرن سنگھ سے زیادہ بے عزت ہو کر نکلا۔ میں اپنی جگہ قائم تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ احمد سزائے موت سے بری ہو گیا ہے۔ پہلے پہل میں اِسی کو مزارعے کا قاتل سمجھتا تھا۔ بعد میں مجھے شک ہونے لگا اور جب کیس کورٹ میں گیا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ احمد بے گناہ ہے۔

پولیس حوالدار کی حیثیت سے تو مَیں صرف اس بات پر ہی بہت خوش تھا کہ ایک کیس ٹھکانے لگا لیکن انسان کی حیثیت سے میں بہت سوچا کرتا تھا کہ مزارعے کا قاتل کون تھا؟ احمد کو جاگیردار نے کیوں پکڑوایا؟ اور مقتول کی جوان لڑکی کا قتل کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ وہ کہاں چلی گئی ہے۔ اور احمد اسے کیوں اپنی عزت سمجھ کر تفتیش میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا؟ اور سب سے زیادہ حیرت والی واردات تو جاگیردار کا قتل تھا۔ اُسے گولی مارنے والے کا بال برابر سُراغ بھی نہیں مل رہا تھا۔

یہ سوال مجھے بے چین کرتے رہتے تھے۔ مزارعے کا قتل عام قسم کی واردات نہیں بلکہ ڈرامہ تھا۔ میں یہ ڈرامہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ہم اپنے علاقے میں تو جاتے ہی رہتے تھے۔ مَیں نے احمد کے ساتھ دوستی پیدا کر لی۔ وہ بہت ہی اچھا آدمی تھا اور باعزت خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ہماری دوستی پکی ہو گئی تو میں نے ایک روز اُسے کہا کہ وہ مجھے پولیس کا ملازم نہ سمجھے، نہ میں مخبری کر رہا ہوں۔ مجھے مزارعے کے قتل کا راز بتا دے۔ وہ فوراً مان گیا اور کہنے لگا کہ اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے جو ڈرامہ سنایا وہ آج تیس سال گزر جانے کے بعد بھی مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ اُس نے سُنایا:

"مَیں ایک روز فلاں گاؤں چلا گیا۔ اپنی ذات برادری کے ایک گھر

ں ماتم ہو گیا تھا۔ میری بیوی میرے ساتھ تھی۔ اپنے دونوں بچے بہت چھوٹے تھے۔ دودھ پیتے بچے کو ہم ساتھ لے گئے۔ بڑے کو نانی کے پاس چھوڑ گئے۔ ہمیں اُسی رات واپس آنا تھا۔ وہاں گئے۔ شام کو جنازہ پڑھا اور رات ابھی شروع ہوئی تھی جب میں اور میری بیوی اپنے گاؤں کو چل پڑے۔ لوگوں نے ہمیں روکا اور کہا کہ رات کا وقت ہے۔ راستہ خطرناک ہے۔ صبح کو چلے جانا، لیکن ہم ماتم والے گھر رات نہیں گزارنا چاہتے تھے۔ پانچ چھ کوس کا فاصلہ تھا۔ ہم نکل کھڑے ہوئے۔"

احمد کی کہانی آگے سُننے سے پہلے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس علاقے سے اسے گزرنا تھا، وہاں سے ایک برساتی نالہ گزرتا تھا جو گہرائی میں تھا۔ برسات کا موسم نہ ہو تو نالہ خشک رہتا تھا۔ اس کے کنارے پر دُور دُور تک علاقہ اونچا نیچا اور ویران تھا۔ درخت زیادہ تھے۔ اس نالے کے اندر رہزنی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک تو نامی گرامی رہزن اور ڈاکو تھے جو اکیلے دکیلے دیہاتی پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے۔ وہ رُوپے پیسے والوں کو لُوٹتے تھے۔ باراتوں اور ڈولیوں کو لُوٹ لیتے تھے اور ہاتھ نہیں آتے تھے۔ دوسری قسم کمینے رہزنوں کی تھی جو اکیلے اور نہتے راہ گیر پر بھی حملہ کر دیتے اور اُسے زخمی کر کے لُوٹتے تھے خواہ اُس کی جیب سے صرف ایک دونی نکلے۔

احمد جوان تھا اور نڈر۔ اُس کی بیوی بھی جوان اور دلیر تھی۔ احمد کے پاس کلہاڑی تھی۔ دُودھ پیتا بچہ اُس کی بیوی نے اُٹھا رکھا تھا۔ وہ گپ شپ لگاتے چلتے گئے۔ چاندنی صاف تھی۔ اکتوبر نومبر کا موسم تھا۔ وہ نالے میں سے گزر کر اُونچے کنارے میں بنے ہوئے ایک راستے سے اُوپر چڑھے۔ اُس وقت احمد آگے اور اس کی بیوی چار قدم پیچھے تھی۔

احمد نے یہ واقعہ اپنی زبان میں اس طرح سُنایا:

"کنارا اُونچا تھا اس لیے راستے کی ڈھلان زیادہ تھی۔ میں اوپر چڑھ

گیا۔ بیوی بچے کو اُٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ چڑھ رہی تھی۔ میں ذرا آگے نکل گیا۔ اچانک مجھے بیوی کی ہلکی سی چیخ سنائی دی اور بچہ بڑی زور سے رویا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو شفاف چاندنی میں مجھے یہ نظر آیا کہ ایک آدمی نے پیچھے سے بازو میری بیوی کی گردن کے گرد لپیٹ کر اس کی آواز دبا رکھی تھی اور دوسرے آدمی نے اس کی ٹانگیں بازوؤں میں جکڑ کر اسے اُٹھا لیا تھا۔ میرا بچہ زمین پر پڑا رو رہا تھا۔ وہ ماں کے بازوؤں سے گر پڑا تھا۔ میں نے دیکھا لیکن میں بیوی کی کوئی مدد نہ کر سکا کیونکہ ایک دو سیکنڈ میں دو اور آدمی میری طرف دوڑ کر آئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ وہ چار تھے اور میں اکیلا۔ میں ان کے مقابلے میں آ گیا۔ دونوں نے مل کر مجھ پر وار کیا۔ میں نے ایک کی لاٹھی کو تو ہوا میں ہی کلہاڑی کی ضرب سے روک لیا اور میری ضرب سے اُس کی لاٹھی ٹوٹ گئی۔ دوسرے کی لاٹھی میرے کندھے کو چھو کر زمین پر لگی کیونکہ میں ایک طرف ہو گیا تھا.....

"ان میں سے ایک نے دُوسروں کو آواز دے کر کہا 'پہلے اسے ختم کرو۔ یہ لٹھ باز معلوم ہوتا ہے' ——— میں نے ٹوٹی ہوئی لاٹھی والے پر وار کیا لیکن وہ تیزی سے ایک طرف ہو کر بچ گیا۔ انہوں نے مُنہ اور سر پگڑیوں میں لپیٹ رکھے تھے اس لیے پتہ نہیں چلتا تھا کہ سکھ ہیں یا مُسلمان۔ دوسرے دو آدمیوں نے میری بیوی کو جکڑ رکھا تھا اور میرا بچہ زمین پر پڑا رو رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ بچے پر وار نہ کر جائیں۔ میں دوڑ کر بچے کے قریب گیا تو لاٹھیوں والے دونوں میرے پیچھے آئے۔ ان کے پیچھے مجھے ایک اور آدمی آتا نظر آیا۔ اس سے مجھے اور ڈر آیا کہ وہ پانچ ہیں اور میں اکیلا۔ وہ میری بیوی کو اُٹھا لے جانا چاہتے تھے۔ میری کسی کے ساتھ دُشمنی نہیں تھی۔ وہ ڈاکو تھے.....

"پانچویں آدمی نے دو ڈاکوؤں کے پیچھے آکر ان میں سے ایک کے سر پہ وار کیا۔ اُس کے پاس لاٹھی تھی۔ ڈاکو چکرا کر گرا۔ اُس کا ساتھی جونہی گھوما، پانچویں آدمی نے دائیں طرف سے لاٹھی گھما کر اُس کے سر پہ ماری۔ وہ بھی چکرایا۔ میں بے حد حیران ہُوا کہ یہ پانچواں آدمی کون ہے۔ آنکھ جھپکتے اُس نے دو کو اندھا کر دیا اور اُس نے آواز دی — "گھبرانا نہیں جوان، میں تمہارے ساتھ ہوں" — اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہے.....

"دونوں ڈاکو سنبھل ہی رہے تھے کہ اُس نے ایک کی کمر پہ لاٹھی ماری اور دوسرے پر میں نے وار کیا لیکن کلہاڑی اُلٹی ماری۔ یہ وار اُس کے دائیں کندھے پر پڑا۔ مجھے ایسے کڑک کی آواز آئی جیسے اس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ وہ دونوں اتنی تیزی سے بھاگ پڑے کہ جنوں کی طرح غائب ہو گئے۔ ہم دونوں اُن دو کی طرف دوڑے جو میری بیوی کو اُٹھا کر تھوڑی دُور چلے گئے تھے۔ ہمیں اپنے پیچھے آتا دیکھ کر ایک نے میری بیوی کو چھوڑا اور ہمارے مقابلے کے لیے آیا۔ اُس کے پاس کلہاڑی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اکیلا ہوں لیکن دو کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ بھاگنے کا راستہ دیکھنے لگا لیکن ہم نے اِدھر اُدھر ہو کر اُسے روک لیا.....

"اُس نے مجھ پہ وار کرنا چاہا تو پیچھے سے میرے اجنبی ساتھی نے اُس کے سر پہ لاٹھی مار کر اُسے چکرا دیا۔ وہ اُس کی طرف ہُوا تو پیچھے سے میں نے کلہاڑی کا اُلٹا دستہ اُسے اتنی زور سے گردن پہ مارا کہ اُس کے مُنہ سے ہائے نکل گئی اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح بہت تیز بھاگا۔ اُس نے نالے کے کنارے سے نالے میں چھلانگ لگا دی.....

"ہم چوتھے کی طرف دوڑے تو وہ میری بیوی کو چھوڑ کر نالے کی طرف دوڑا اور نالے میں چھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔ میں نے دوڑ کر

اپنے بچّے کو سینے سے لگایا۔ بیوی دوڑی آئی۔ اس نے بچّہ مجھ سے لے لیا۔ میں نے اسے کہا کہ یہیں بیٹھ کر اسے دُودھ پلاؤ۔ یہ ڈرا ہُوا ہے۔ بیوی اسے دُودھ پلانے لگی۔ میں اور میرا ساتھی اِدھر اُدھر گھوم پھر کر پہرہ دینے لگے۔ بیوی بچّے کو دُودھ پلا چکی تو ہم چل پڑے۔ بیوی ڈری ہوئی بالکل نہیں تھی۔ سخت غصّے میں ڈاکوؤں کو گالیاں دے رہی تھی.....

"میں نے اُس اجنبی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ وہ تو اللہ کا بھیجا ہُوا فرشتہ تھا۔ خُدا کی قسم میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ میری مدد کے لیے آسمان سے اُترا ہے اور ابھی غائب ہو جائے گا لیکن وہ انسان تھا اور وہ اُن انسانوں میں سے تھا جنہیں ہم زمیندار اور جاگیردار لوگ انسان نہیں مویشی سمجھا کرتے ہیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مزارعہ ہے اور فلاں گاؤں میں کسی کی زمین بٹائی پر کاشت کرتا ہے۔ (گاؤں کے نام مصلحتاً حذف کیے جا رہے ہیں) وہ کسی کام سے کہیں گیا تھا اور نالے کے کنارے کے ساتھ ساتھ واپس آ رہا تھا۔ اس کا نام محمّد علی تھا۔ اسے یہ چاروں آدمی نظر آئے۔ وہ اُس وقت درختوں کے نیچے تھا اس لیے ان چاروں کو نظر نہ آیا۔ وہاں سے اُس نے مجھے بیوی کے ساتھ نالے میں سے گزرتے دیکھا پھر اس نے ان چاروں کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ پاؤں پہ سرکتے سرکتے کنارے کے راستے گہری جگہ میں چھپ گئے۔ محمّد علی سمجھ گیا کہ وہ اس مرد اور عورت پہ حملہ کریں گے جو نالے میں چلے آ رہے ہیں، یعنی میں اور میری بیوی.....

"بالکل وہی ہُوا جو اُس نے سوچا تھا۔ وہ چھپ کر بیٹھ گیا اور جب ڈاکوؤں نے ہم پہ حملہ کیا تو وہ میری مدد کے لیے آ گیا۔ اگر وہ نہ آتا تو میں قتل ہو جاتا، بیوی کو ڈاکو اُٹھا لے جاتے اور بچّہ زمین پر پڑا تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔

محمد علی اکیلا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر میری مدد کی حالانکہ وہ مجھے بالکل نہیں جانتا تھا کہ میں کون ہوں۔ اس سے بڑا اور احسان کیا ہو سکتا ہے.....

"میں نے اُسے کہا کہ وہ میرے گاؤں میں آجائے تو جتنی زمین سنبھال سکتا ہے سنبھال لے اور پوری فصل وہ گھر رکھے لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ مرد کسی لالچ سے مردوں کی مدد نہیں کیا کرتے.... میرا گاؤں آگیا۔ اُس کا گاؤں ابھی دُور تھا۔ میں نے اُسے روک لیا اور رات اپنے گھر میں رکھا۔ وہ تیئس چوبیس سال کی عُمر کا جوان تھا۔ دوسرے دن جب وہ چلنے لگا تو میں نے اُسے کپڑوں کا ایک جوڑا اور ایک سو روپیہ دیا۔ اُس نے ہاتھ نہ رکھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر کہنے لگا کہ اگر تم مجھے انعام دینا چاہتے ہو تو مجھے کپڑے اور یہ رقم نہ دو، میری مدد کرو.....

"اُس نے مجھے اپنی ایک مشکل بتائی۔ وہ یہ تھی کہ اس کی منگنی اُس مزارعے کی بیٹی کے ساتھ ہو چکی تھی جو قتل ہو گیا تھا اور جس کے قتل میں مجھے سزائے موت ملی تھی۔ یہ منگنی اُس وقت ہوئی تھی جب لڑکی ابھی دس گیارہ سال کی تھی۔ اس کے بعد لڑکی کے ماں باپ اس جاگیردار کے مزارعے جا بنے اور محمد علی اپنے گاؤں میں کسی کی زمین کاشت کرتا رہا۔ وہ مقتول کے گھر کئی دفعہ گیا تھا.....

"لڑکی جوان ہوئی تو وہ بہت خوب صورت نکلی۔ جاگیردار نے اس پر نظر رکھ لی۔ اس کی جاگیر کے کسی بھی مزارعے کی بیوی ذرا اچھی شکل اور عمر کی ہو یا کسی مزارعے کی بیٹی جوان اور اچھی شکل والی ہو، یہ مردود جاگیردار اسے اپنی عیاشی کا ذریعہ بنا لیتا تھا۔ عیاشی کے لیے اس نے الگ بیٹھک بنائی ہوئی تھی.....

"محمد علی کے والدین شادی کا دن مقرر کرنے گئے تو لڑکی کے والدین

نے جواب دیا کہ دن جاگیردار مقرر کرے گا۔ جاگیردار کو بتایا جا چکا تھا کہ لڑکی کی منگنی بچپن میں ہو چکی ہے۔ اس کے بعد محمد علی کے والدین دو تین دفعہ دن مقرر کرنے گئے اور ہر بار انہیں یہی جواب ملا کہ دن چوہدری صاحب مقرر کریں گے۔ آخری بار جب وہ گئے تو لڑکی کی ماں نے محمد علی کی ماں کو بتایا کہ جاگیردار بدکار آدمی ہے اور وہ لڑکی کو خراب کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے کئی بار کہا ہے کہ لڑکی کو اُس کے گھر کے کام کے لیے بھیجا جائے، لیکن لڑکی صاف جواب دے چکی ہے۔ ہم غریب لوگ چوہدری کا دیا کھاتے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ کیا کریں اور کہاں جائیں.....

"محمد علی کے ماں باپ واپس آ گئے اور محمد علی کو بتایا۔ محمد علی غیرت مند جوان تھا۔ اس نے لڑکی کو بھگا لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک روز لڑکی کے گھر چلا گیا۔ جس لڑکی کے ساتھ منگنی ہو جائے اس کے ساتھ منگیتر بات نہیں کر سکتا لیکن محمد علی نے اس رواج کی پرواہ نہ کی اور لڑکی سے مل کر اس سے پوچھا کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔ لڑکی صاف تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس کے ساتھ جانے کو تیار ہے۔ لڑکی نے ماں باپ اور جاگیردار کی پرواہ نہ کی اور وہ اُسی وقت اس کے ساتھ دن دہاڑے چلنے کو تیار ہو گئی۔ ماں باپ نے اُسے روکا لیکن وہ غصّے میں آگئی اور انہیں کہا کہ وہ ان کی خاطر اپنی عزت قربان نہیں کر سکتی۔ وہ محمد علی کے ساتھ چل پڑی لیکن کھیتوں میں سے گزرتے انہیں دو مزارعوں نے روک لیا۔ یہ چوہدری کے خاص مزارعے تھے جن کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ اُس کے جاسوس ہیں اور لڑکی پر چوری چھُپے پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ انہوں نے محمد علی سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور لڑکی کو کہاں لے جا رہا ہے۔ محمد علی نے انہیں بتایا کہ وہ لڑکی کا منگیتر ہے اور اسے ایک دو دنوں کے لیے اپنے گاؤں لے جا رہا ہے.....

"ان دونوں مزارعوں نے لڑکی کو واپس گھر بھیج دیا اور محمد علی کو پکڑ کر جاگیر دار کے پاس لے گئے۔ جاگیر دار نے اس کی بہت بے عزتی کی اور اسے دھمکی کہ وہ پھر کبھی اس کی جاگیر میں آیا تو اس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ دونوں مزارعوں نے چوہدری کو خوش کرنے کے لیے محمد علی کو تھپڑ مارے اور دھکے دے دے کر اپنی حدود سے باہر چھوڑ آئے۔۔۔۔۔

"محمد علی نے مجھے یہ قصہ سُنا کر کہا کہ اگر میں لڑکی کو گھر سے نکال لاؤں تو اُس کا احسان چکایا جائے گا۔ اس نے کہا "مجھے کچھ نہیں چاہیئے نہ کپڑے نہ روپیہ پیسہ نہ زمین۔ مجھے اپنی منگیتر چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ چوہدری کی بے نکاحی بیوی بننے سے پہلے گھر سے نکل آئے یا مر جائے"۔۔۔۔۔ میں تیار ہو گیا۔ محمد علی کو گاؤں بھیج دیا اور اُسی روز لڑکی کے گھر چلا گیا"۔

میں احمد کی کہانی توڑ کر بتانا چاہتا ہوں کہ لڑکی اور احمد کے گاؤں کہاں کہاں تھے۔ لڑکی کے گاؤں کے بارہ تیرہ گھرانے تھے جو جاگیر دار کے گھر سے ایک کوس دُور تھے۔ احمد کا گاؤں وہاں سے کوئی دو کوس دور تھا اور محمد علی کا گاؤں احمد کے گاؤں سے تقریباً تین کوس اور لڑکی کے گاؤں سے اس سے ذرا زیادہ ہو گا۔

احمد لڑکی کے گھر چلا گیا۔ اُس نے مجھے اس طرح سُنایا:

"لڑکی کے باپ کو میں نے تسلی دلاسہ دیا اور کہا کہ میں لڑکی کو چوری چھپے محمد علی کے گھر پہنچا دوں گا اور تم لوگ چوہدری کو بتانا کہ لڑکی رات کے وقت بھاگ گئی ہے۔ باپ پہلے تو ڈرتا رہا۔ کوئی باپ اپنی لڑکی کو کسی غیر مرد کے ساتھ جانے نہیں دیتا خواہ اُس کی جان چلی جائے لیکن یہ لوگ مزارعے ہیں۔ انہیں ہم نے یقین دلا دیا ہے کہ تمہاری کوئی عزت نہیں۔ تمہاری بیٹیاں اور بیویاں بھی تمہاری نہیں۔ تم صرف اناج اُگانے اور گالیاں کھانے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ اس لڑکی کا باپ جاگیر دار کے عتاب سے ڈرتا تھا، ویسے وہ رضامند تھا کہ لڑکی چلی جائے۔۔۔۔۔

"میں جب وہاں سے نکلا تو دو مزارعوں نے مجھے روکا۔ وہ مجھے جانتے تھے کہ میں کسی کا مزارعہ نہیں بلکہ اپنے گاؤں کا خوش حال زمیندار ہوں۔ انہوں نے فرمانبرداری سے مجھ سے پوچھا کہ میں کدھر آیا تھا۔ میں نے انہیں ٹال دیا اور اپنے گاؤں آ گیا۔ تیسرے دن میں پھر لڑکی کے گھر گیا اور اُسے بتا آیا کہ آج سے چوتھی رات میں اُسے لینے آؤں گا۔ اُس روز بھی ان مزارعوں نے مجھے دیکھا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ لڑکی کے لیے پہرہ زیادہ ہو گیا ہے۔۔۔۔۔

"میں اپنے گاؤں آ گیا۔ شام کے وقت جاگیر دار کا ایک آدمی میرے پاس آیا اور مجھے الگ کر کے کہا کہ چوہدری صاحب نے کہا ہے کہ تم اپنی کرتوت سے باز آ جاؤ ورنہ تمہارا خاندان ساری عمر روتا رہے گا۔ جاگیر دار کو مخبروں اور جاسوسوں نے بتا دیا تھا کہ میں لڑکی کے گھر جاتا ہوں۔ میں نے اُس آدمی سے کہا کہ اپنے چوہدری سے کہنا کہ تمہاری بادشاہی اپنی جاگیر کے اندر ہے اور اُسے یہ بھی کہنا کہ تم بدکاری سے باز آ جاؤ ورنہ کُتّے کی موت مرو گے۔۔۔۔۔

"میں دوسرے دن محمد علی کے گاؤں گیا اور اُسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اُسے بتا دیا کہ میں لڑکی کو لا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے گا لیکن میں نے اُسے کہا کہ اس طرح میں احسان پوری طرح نہیں چکا سکوں گا اور یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ کہیں مارا ہی نہ جائے۔۔۔۔۔

"وہ رات آئی جب مجھے لڑکی کو لانا تھا۔ میں لڑکی کو سب کچھ سمجھا آیا تھا۔ مجھے گاؤں کے قریب ایک خاص جگہ کھڑے ہونا تھا اور لڑکی کو وہاں تک پہنچنا تھا۔ میں وہاں جا کھڑا ہوا۔ اُدھر سے دو آدمی باتیں

رستے آہستہ آہستہ آ رہے تھے ۔ مَیں چُھپ کر بیٹھ گیا ۔ وہ میرے قریب سے گزرے تو اُن کی باتوں سے مَیں نے اندازہ لگایا کہ وہ پہرہ دے رہے ہیں ۔ وہ آگے چلے گئے تو مجھے اندھیرے میں کوئی اپنی طرف آتا دکھائی دیا ۔ رات گُھپ اندھیری تھی ۔ وہ سایہ میرے قریب آ گیا تو پتہ چلا لڑکی ہے ۔ مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا ۔ لڑکی نے مجھے کہا ـــــ 'جلدی چلو۔ مَیں گھر والوں کو سوتا چھوڑ آئی ہوں' ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"لڑکی نے یہ غلطی کی کہ ذرا اُونچی آواز میں بات کی ۔ رات کی خاموشی میں اُس کی آواز دُور تک پہنچ گئی اور پہرے داروں نے سُن لی ۔ انہوں نے آواز دی ـــــ 'کون ہے؟' ـــــ مَیں لڑکی کو ساتھ لے کر فصل کی اوٹ میں جُھک جُھک کر چل پڑا ۔ پہرے دار دوڑے آئے ۔ انہوں نے شاید ہمیں دیکھ لیا تھا ۔ وہ ہماری طرف آ رہے تھے ۔ میں نے لڑکی کو فصل کے اندر چُھپا دیا اور خود بھی چُھپ گیا ۔ وہ دونوں مینڈھ پر آ رہے تھے ۔ ہمارے قریب آ کر رُک گئے ۔ ایک کہہ رہا تھا کہ کوئی آدمی تھا ۔ دُوسرے نے کہا ـــــ 'نہیں یار، کُتا تھا' ـــــ پھر ایک کی آواز آئی ـــــ 'چلو اُس کے گھر چل کر دیکھ لیں ۔ حرامزادی گھر ہے یا نہیں ۔' دُوسرے نے گالی دے کر کہا کہ عیش کرے گا چوہدری اور ہم بیکار کا پہرہ دیتے پھر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"دونوں گاؤں کے اندر چلے گئے تو ہم فصل سے نکلے اور چُھپتے چُھپاتے دُور نکل آئے ۔ جب اپنے گاؤں کے راستے پر پہنچے تو محمد علی کلہاڑی لیے کھڑا تھا ۔ دُور سے ہم نے دیکھا کہ لڑکی کے گاؤں کے اردگرد لالٹینیں گھوم پھر رہی تھیں ۔ وہ لڑکی کو تلاش کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"میں نے لڑکی اور محمد علی کو ایک اور گاؤں میں رکھنے کا انتظام کر لیا تھا ۔ رات ہی رات انہیں وہاں چھوڑ آیا اور رات کے پچھلے پہر اپنے گھر پہنچا ۔ میری

بیوی کے سوا کسی کو علم نہیں تھا کہ میں نے رات کو کیا کیا ہے ۔ بے شک یہ ایک نیکی تھی لیکن اپنی برادری والے یہی کہہ کر مجھے بدنام کر دیتے کہ مَیں نے ایک لڑکی اغوا کی یا کرائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"میں نے دوسرے دن جا کر ان کا نکاح پڑھوا دیا اور محمد علی لڑکی کو اپنے گھر لے گیا ۔ خطرہ یہ تھا کہ جاگیر دار اسے وہاں کوئی نقصان نہ پہنچائے ۔ میں نے اپنے دوست سے مل کر ایک دُور دراز گاؤں میں محمد علی کو کافی ساری زمین بٹائی پر دلا دی اور وہ اپنے سارے کنبے کو لے کر وہاں چلا گیا ۔ ۔ ۔ ۔

"جس روز میں نکاح پڑھوا کر اپنے گاؤں میں آیا تو میں بہت ہی خوش تھا کہ مَیں نے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ ابھی میری سخت آزمائش باقی ہے ۔ شام کے وقت جاگیر دار کا وہی آدمی جو مجھے اُس کی دھمکی والا پیغام دینے آیا تھا ، میرے گھر آیا اور جاگیر دار کا یہ پیغام مجھے دیا ـــــ 'لڑکی واپس کر دو ورنہ پچھتاؤ گے' ـــــ مَیں نے جواب دیا ـــــ 'لڑکی اپنے سر کے سائیں کے پاس پہنچ گئی ہے ۔ ہمت ہے تو جا کے لے آؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اپنے چوہدری سے کہنا کہ لڑکی کو میں نے اپنے ہاتھوں تمہاری جاگیر سے نکال کر وہاں پہنچایا ہے' ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اس کے بعد مجھے کچھ بھی پتہ نہ چلا کہ جاگیر دار کی بادشاہی کے اندر کیا ہو رہا ہے ۔ مَیں اپنی جگہ ہوشیار رہا لیکن جاگیر دار نے ایسی چال چلی جو مَیں نے کبھی سوچی بھی نہیں تھی ۔ دس بارہ دنوں بعد سکھ تھانیدار نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ باہر نکلا تو آپ بھی تھانیدار کے ساتھ تھے ، پھر جو کچھ آپ نے کیا اور جو کچھ جاگیر دار نے کیا وہ تو سب آپ کو معلوم ہے ۔ میں اگر لڑکی اور محمد علی کو اپنی صفائی میں عدالت میں لے آتا تو مجھے سزائے موت نہ مل سکتی ۔ مَیں نے آپ کے ساتھ بھی لڑکی کا ذکر نہ کیا ۔ جب آپ نے مجھ سے اُس کے متعلق پوچھا تو مَیں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میری عزت ہے'

ا[illegible]ی نہیں [illegible]ساؤں گا۔ وہ غریب اور پاک صاف لڑکی ہے۔ مَیں جب جیل میں تھا تو محمد علی مجھے ملنے کے لیے وہاں گیا تھا۔ وہ بہت روتا تھا اور کہتا تھا کہ میرے پاس پلّے کچھ بھی نہیں جس سے تمہاری مدد کروں.....

"مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ اللہ نے میری مدد کی اور جاگیردار کو سزائے موت دے دی۔ میں نے اُسے ایک بار یہ پیغام بھیجا تھا کہ بدکاری سے باز آجاؤ ورنہ کُتّے کی موت مرو گے۔ دیکھ لو وہ کیسی موت مرا۔ اُس کے قاتل کا کسی کو پتہ نہیں چلا۔ وہ مرا بھی اس طرح کہ اس کی لاش باہر زمین پر پڑی رہی....."

"مَیں نے احمد کو رسول پاک صلعم اور قرآن کی قسم کھا کر کہا کہ میں یہ راز دل میں رکھوں گا، مجھے بتا دو کہ جاگیردار کو کس نے گولی ماری تھی۔ اُس نے بھی میری طرح قسمیں کھا کر کہا کہ اُسے بالکل علم نہیں۔ محمد علی غریب مزارعہ ہے۔ وہ اتنی دُور سے آکر اُسے بندوق سے کس طرح مار سکتا تھا۔ میں خود جیل میں تھا۔ میرا کوئی سگا بھائی نہیں، باپ بھی مر چکا ہے اور کون تھا میرا بدلہ لینے والا کوئی بھی نہیں"۔

احمد نے اس کے آگے کہانی اس طرح سُنائی۔ "میں رہا ہو کر آیا تو محمد علی اپنی بیوی کو ساتھ لے کر میرے گھر آیا۔ میں نے انہیں تین چار روز اپنے گھر رکھا۔ لڑکی نے بتایا کہ جاگیردار نے اس کے جوان ہونے پر ایک روز اپنے خاص کمرے میں بلایا اور اس سے سر اور ٹانگیں دبواتا رہا۔ بہت دیر بعد اُس نے لڑکی کو دو روپے دیے اور اگلے روز پھر بلایا۔ لڑکی گئی تو جاگیردار پھر اس سے ٹانگیں دبوانے لگا۔ لڑکی اسے اپنے باپ کی طرح سمجھتی تھی لیکن اُس نے لڑکی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے اوپر گرا لیا۔ لڑکی گھبرا گئی اور ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ جاگیردار نے اُسے چھوڑ دیا اور پانچ روپے دے کر کہا کہ تم تو میری بچّی ہو۔ کل پھر آنا لیکن لڑکی نہ گئی۔ وہ اُس کی نیّت بھانپ گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ خود لڑکی کے گھر پہنچ گیا اور اس گھرانے پر مہربانیاں کرنے لگا۔ ماں باپ لڑکی کو سمجھانے بجھانے لگے کہ وہ جاگیردار کے گھر چلی جایا کرے لیکن لڑکی نہ گئی۔ جب محمد علی کے ماں باپ شادی کا دن مقرر کرنے گئے تو جاگیردار نے جسے پہلے ہی لڑکی کے ماں باپ سے پتہ چل چکا تھا کہ لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے، شادی رُکوائے رکھی۔ پھر لڑکی کو مَیں نکال کر لے گیا"۔

احمد نے لڑکی کی کہانی تو سُنا دی مگر مزارعے یعنی لڑکی کے باپ کا قتل پھر بھی میرے لیے راز ہی رہا۔ پھر اسے کس نے قتل کیا تھا؟ میں نے اپنے طور پر کچھ عرصے بعد یہ راز بھی حاصل کر لیا۔ چونکہ جاگیردار خود بھی قتل ہو چکا تھا، اس لیے اس کے عزیزوں رشتہ داروں کے ساتھ تفتیش کے سلسلے میں اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ ایک روز میں نے اسے الگ کر کے پوچھا کہ وہ مزارعے کے قتل کے متعلق کچھ بتا سکتا ہے یا نہیں۔ اُس نے باپ کی طرح جھوٹ بولا کہ مزارعے کو احمد نے قتل کیا تھا۔

"دیکھو بیٹا"۔ میں نے اُسے کہا۔ "مزارعے کا قاتل تمہارا باپ تھا۔ اُس نے مزارعے کو اپنے گھر قید رکھ کر بھُوکا مارا ہے۔ ڈاکٹر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھو جس پر احمد کو وکیل نے بری کرایا ہے۔ جب تک تم یہ راز نہیں کھولو گے تمہارے باپ کے قاتل کا سراغ نہیں مل سکتا"۔

لڑکا گھبرا گیا۔ آخر میرے زور دینے پر وہ پھُوٹ پڑا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے ایک روز باپ کے الگ مکان میں جھانکا تھا۔ وہاں گھر کے کسی فرد کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جاگیردار گھر والوں کو بتایا کرتا تھا کہ وہاں وہ مزارعوں کے جھگڑے سنتا اور فیصلے کرتا ہے۔ اس لڑکے نے ایک رات وہاں جھانک کر دیکھا تو اسے اندر کمرے میں لڑکی کا باپ نظر

آیا۔ اُس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور اُس کا باپ اس کی پیٹھ پر بید مار مار کر کہہ رہا تھا____ "جب تک یہ نہیں بتائے گا کہ تو نے اپنی بیٹی کو کہاں بھیجا ہے نہیں چھوڑوں گا"____ اور مزارعہ رو رو کر کہہ رہا تھا کہ اُسے کچھ پتہ نہیں۔

اس کے بعد لڑکے کو کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہُوا۔ اتنی سی بات سے سارا بھید کھل گیا اور مجھے ہائی کورٹ میں وکیل کی جرح یاد آ گئی۔ جاگیردار کو شک تھا کہ مزارعے نے خود لڑکی کو کہیں بھیج دیا ہے۔ اس کی اُسے یہ سزا دی کہ اُسے اپنی قید میں بھوکا رکھا اور بید سے مار مار کر جان سے ہی مار ڈالا۔ جب وہ مر گیا تو اُسے کھیتوں میں لے جا کر سر میں کلہاڑی مار دی یا ہو سکتا ہے کہ اُس وقت وہ زندہ ہی ہو جب کھیتوں میں لے جا کر کلہاڑی سے اُس کا سر کھول دیا گیا اور جاگیردار نے اپنے مزارعوں کو بیان پڑھوا کر موقعہ کے گواہ بنا دیا اور احمد کو گرفتار کرا دیا۔ اُس نے ایک تیر سے دو شکار مارنے کی کوشش کی تھی، پھر مجھے اور کرن سنگھ کو اڑھائی ہزار روپے رشوت دے کر تفتیش میں لڑکی کا نام نہ آنے دیا۔

اب جاگیردار کا قتل رہ گیا تھا جس کے متعلق کوئی سُراغ نہیں مل رہا تھا۔ اسے گولی ماری گئی تھی۔ رات کا وقت تھا اور اُس کے بھتیجے کی شادی تھی۔ بے شمار آتش بازی کے گولے چل رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ بندوق کے دھماکے کو بھی گولے کا دھماکہ سمجھتے رہے اور قاتل رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ملک تقسیم ہو گیا اور جاگیردار کا قتل ہندوستان کی فائلوں میں بھید بن کر وہیں رہ گیا۔ ہم لوگ پاکستان میں آ گئے۔ احمد اور اُس کی ساری برادری پاکستان میں ایک جگہ آباد ہوئی۔ مجھے بھی وہیں زمین ملی۔ میں ریٹائر ہو گیا تو کھیتی باڑی شروع کر دی۔

پچھلے مہینے ایک بوڑھی عورت مر گئی تو احمد کے ہندوستان والے گاؤں کے ایک پنشنر صوبیدار نے مجھے کہا کہ جاگیردار کا قاتل دفن ہو گیا ہے۔ میں بہت حیران ہُوا۔ جو دفن ہو گئی تھی وہ احمد کی ماں تھی۔ احمد دو سال پہلے مر گیا تھا۔

صوبیدار نے مجھے قبرستان میں ہی جاگیردار کے قتل کی کہانی سُنا دی۔ اُس نے سُنایا____ "جاگیردار کو احمد کی ماں نے گولی ماری تھی جو آج دفن ہو گئی ہے۔ یہ راز میرے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اسے یا گاؤں میں کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ جاگیردار نے احمد کو کس دُشمنی میں اپنے مزارعے کے قتل میں گرفتار کرایا ہے۔ احمد نے ہی بتایا تھا کہ اس کا ایک روز جاگیردار کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے جاگیردار کی اس کے مزارعوں کے سامنے بے عزتی کی تھی۔ جب احمد کو سیشن کورٹ سے سزائے موت ہو گئی تو اُس کی ماں پاگل ہونے لگی۔ ایسی مصیبت میں ہم لوگ پیروں، مرشدوں کے آگے جا سجدے کرتے ہیں اور تعویذ لکھوا لکھوا کر پاگل ہوتے رہتے ہیں لیکن اس عورت کو سب پیر مُرشد بھول گئے اور وہ ایک ہی رَٹ لگانے لگی کہ میرا دُوسرا بیٹا ہوتا یا میرا خاوند زندہ ہوتا تو میں اس چوہدری کو قتل کرا دیتی جس نے میرے بے گناہ بیٹے کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا ہے۔ احمد اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں پاگل نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا.....

"گاؤں برادری کے ہر فرد کو اس کے ساتھ ہمدردی تھی لیکن میرے دل میں کچھ زیادہ ہی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ میرا خون کھولتا رہتا تھا کہ دوسرے گاؤں کے ایک آدمی نے ہمارے گاؤں کے ایک اتنے اچھے جوان کو بے گناہ پھنسا دیا ہے۔ مجھے ان کی دُشمنی کا پتہ نہیں تھا کہ کیا تھی۔ ایک روز احمد کی ماں میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ صوبیدارا! تمہارے

پاس دونالی بندوق ہے ۔ اس میں مجھے دو کارتوس بھر دو ۔ میں چوہدری کو ماروں گی.....

"میں نے اسے تسلی دی کہ اپیل دائر ہو گئی ہے اور جو نیا وکیل کیا ہے، اُس نے یقین دلایا ہے کہ احمد بری ہو جائے گا ۔ احمد کی ماں نے جواب دیا کہ کل چوہدری کا ایک آدمی یہاں کہہ گیا ہے کہ ہمّت ہے تو اپنے آدمی کو پھانسی سے اتار لو، میں اپیل کی تاریخ ہی نہیں نکلنے دُوں گا...

"واقعی پکی پیشی کی تاریخ نہیں نکل رہی تھی ۔ اس عورت نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اسے بندوق دے دوں لیکن وہ اسے مارے گی کیسے؟ یہ مشکل سوال تھا ۔ اس نے ایسی ایسی باتیں کیں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ پاگل کر دیا ۔ مَیں تیار ہو گیا کہ چوہدری کو مَیں اپنے ہاتھوں گولی ماروں گا ۔ یہ ماں جب دانت پیس کر بولتی تھی اور اپنے اکلوتے بیٹے کا نام لیتی تھی تو پتھر بھی پگھل جاتے تھے ۔ مَیں نے اُسے کہا کہ چوہدری کو مَیں قتل کر دوں گا لیکن اس نے میرا گریبان پکڑ کر اور لال سُرخ آنکھیں نکال کر کہا ___ 'خدا تمہیں تمہارے بچوں کے سر پر سلامت رکھے ۔ بچّہ میرا پھانسی چڑھ رہا ہے ۔ میں بھی اس کے ساتھ پھانسی چڑھوں گی ۔ تمہارے ہاتھ سے کیوں کسی کو قتل کراؤں؟....

"میں نے اسے یقین دلایا کہ بندوق دے دوں گا لیکن وہ جلدبازی سے کام نہ لے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چوہدری کو مارے بغیر ہی بندوق سمیت پکڑی جائے ۔ مَیں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ یہ راز میرے اور اُس کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیئے ۔ وہ مان گئی ۔ سچّی بات یہ ہے کہ میں دل و جان سے اس قتل میں شریک ہو گیا اور احمد کی ماں کو گھر بھیج کر سوچنے لگا کہ چوہدری کو کہاں اور کس وقت گولی ماری جائے ۔ دو تین دن گزر گئے ۔ احمد کی ماں میری جان کھاتی رہی اور میں اسے تسلّی دیتا رہا.....

"ایک روز مَیں گاؤں کے چند ایک آدمیوں کے پاس کھڑا گپ شپ

لگا رہا تھا کہ ایک آدمی نے کہا ___ 'چوہدری کے گھر بڑی آتش بازی گئی ہے ۔ بڑے گولے کوئی دو تین سَو ہوں گے ۔ اس کے بھتیجے کی شادی ہے ۔ آج رات وہاں جشن ہو گا' ___ یہ آدمی شہر سے آیا تھا ۔ وہاں اُسے چوہدری کے آدمی ملے تھے ۔ وہ آتش بازی کا سامان لانے گئے تھے ۔ انہوں نے اُسے یہ سب کچھ بتایا تھا ۔ میں پُرانا فوجی تھا ۔ میرے فوجی دماغ نے ایک سکیم سوچ لی ۔ مَیں نے احمد کی ماں کو الگ لے جا کر سکیم سمجھا دی ۔ مجھے معلوم تھا کہ جب گاؤں میں کسی کی شادی کا کھیل تماشا ہو تو گاؤں کا بچّہ بچّہ وہاں جمع ہو جاتا ہے ۔ کسی کو اپنے گھر کا فکر نہیں رہتا.....

"جب رات اندھیری ہو گئی تو میں بندوق میں دو کارتوس ڈال کر باہر نکل گیا ۔ احمد کی ماں باہر انتظار کر رہی تھی ۔ میں اُسے ساتھ لیے چوہدری کے گاؤں کی طرف چل پڑا...... منزل تک ہم ایک گھنٹے میں پہنچ گئے ۔ اندھیرا ہمیں بہت فائدہ دے رہا تھا ۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا ۔ اگر کھلی لڑائی ہوتی تو مَیں اتنا نہ گھبراتا ۔ میں چوروں کی طرح جا رہا تھا ۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہُوا کہ گاؤں میں بالکل ویسا ہی ماحول بنا ہُوا تھا جیسا مَیں نے سوچا تھا ۔ باہر میدان میں رنگ برنگی آتش بازی چلائی جا رہی تھی اور سارا گاؤں ایک جگہ اکٹھے ہو کر تماشا دیکھ رہا تھا ۔ ہوائیاں اُوپر جا رہی تھیں اور کچھ آتش بازی چکر میں گھومتی تھی اور اس میں سے رنگدار شرارے نکلتے تھے ۔ گولے اتنے زیادہ چل رہے تھے جیسے جنگ لگی ہو ۔ دھماکے ہی دھماکے تھے.....

"بندوق احمد کی ماں کے ہاتھ میں تھی ۔ گھوڑے چڑھے ہوئے تھے، صرف انگلی دبانی تھی ۔ ہمیں چھپنے کے لیے بڑی اچھی جگہ مل گئی ۔ وہاں چھپنے کی ضرورت تو تھی ہی نہیں ۔ گاؤں کا سماں ایسا تھا کہ دُوسرے گاؤں کے لوگ بھی شادی پر بلائے گئے تھے ۔ رات کا وقت تھا اس لیے ہمیں کوئی غور سے نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ وہاں ہر کوئی ہر کسی کو شادی میں شریک سمجھتا

تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ چوہدری کو گولی کس طرح ماری جائے۔ بھرے مجمعے میں تو میں نہیں چاہتا تھا کہ احمد کی ماں اسے گولی مارے اور پکڑی جائے۔ وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا.....

"لیکن جب موت آتی ہے تو انسان اپنے آپ ہی موت کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے۔ چوہدری نے بھی یہی کیا۔ میں اور احمد کی ماں گاؤں کی ایک گلی کے منہ پر کھڑے تھے۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ آسمان میں گولے پھٹ رہے تھے اور زمین پر بھی گولے پھٹ رہے تھے۔ ہمیں گلی میں کسی کی آواز بالکل اپنے قریب سنائی دی ——— 'اوئے کون ہو تم؟ جاؤ ذرا معراجدین کو میرے پاس بھیج دو' ——— وہ چوہدری تھا۔ میں نے کہا ——— 'چوہدری صاحب'؟ ——— وہ ہم سے آٹھ دس قدم دور تھا۔ اُس نے غصے سے کہا ——— 'ہاں ہاں، دوڑ کر جاؤ۔ معراجدین کو دیکھو کہاں ہے' ——— احمد کی ماں نے میرے کہے بغیر گولی چلا دی لیکن اس کے ساتھ ہی ہوا میں چار پانچ گولے پھٹے اور بندوق کا دھماکہ گولوں کے دھماکوں میں مل گیا۔ خود مجھے یہی دھوکہ ہوا تھا لیکن احمد کی ماں نے کہا ——— 'دیکھو صوبیدار، مردود زندہ تو نہیں؟' چوہدری گر پڑا تھا۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ گولی چل چکی ہے.....

"اب وہاں رُکنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے بہت جلدی سے چوہدری کی نبض دیکھی۔ وہ شاید مر چکا تھا۔ اگر زندہ ہوتا تو ضرور تڑپتا۔ میں نے احمد کی ماں کو بازو سے پکڑا اور وہاں سے کھسکے۔ دوسری گلی میں سے گزر کر گاؤں سے نکل گئے۔ ہمیں کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ مجھے تسلی ہوگئی کہ گاؤں والے بھی بندوق کے دھماکے کو گولے کا دھماکہ سمجھ چکے تھے ورنہ وہاں کا نقشہ کچھ اور ہوتا.....

"گاؤں سے نکل کر ہم دوڑ پڑے۔ بہت دور جا کر تیز تیز چلنے لگے اور

خیریت سے اپنے گاؤں میں داخل ہوگئے۔ میں نے خالی کارتوس زمین میں دبا دیا ——— یہ بڑا کارتوس تھا جس سے شیر جیسا درندہ مارا جاتا ہے۔ میں نے بندوق کی نالیاں وغیرہ خوب صاف کیں اور تیل ڈال دیا۔ آپ نے ہمارے گاؤں کی بندوقیں جمع کر کے پڑتال کی تھی۔ ان میں میری بندوق بھی تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ میری بندوق پر شک نہیں کیا جا سکے گا۔ نالیاں صاف ہو چکی تھیں اور تیل ڈالا جا چکا تھا، پھر آج تیس سال تک یہ راز میرے اور احمد کی ماں کے سینے میں دفن رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ اُس کا انتقام لے چکی ہے۔ آج اس راز کے ساتھ وہ خود بھی دفن ہوگئی ہے"۔

صوبیدار نے بات ختم کر کے کہا ——— "یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ جاگیردار اور احمد کی آپس میں دشمنی کیا تھی۔ احمد نے کبھی کسی کو بتایا نہیں تھا۔ جھگڑا معمولی نہیں تھا ورنہ جاگیردار اُسے قتل کے جھوٹے الزام میں پکڑوا کر اُسے سزائے موت دلانے کے لیے اتنی زیادہ کوشش نہ کرتا"۔

میں نے صوبیدار کو بتایا کہ اصل جھگڑا کیا تھا۔ ساری بات سُن کر صوبیدار نے آہ بھری اور کہا ——— "میں ہمیشہ اس وہم میں پریشان رہا ہوں کہ میں نے جاگیردار کو قتل کروانے کے لیے احمد کی ماں کی جو مدد کی تھی وہ ایک گناہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ احمد واقعی مزارعے کے قتل کا مجرم نہ ہو، اور جاگیردار شاید سچا ہو، لیکن آج تمہاری بات سُن کر مجھے سکون ہوگیا ہے کہ جھگڑا ایک معصوم اور غریب لڑکی کا تھا اور اُس کے باپ کا قاتل جاگیردار تھا اس لیے میں نے جاگیردار کے قتل میں مدد دے کر گناہ نہیں کیا"۔

★بہن کا اغوا★

راجہ محمد علی خان سے میری ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی۔ میں اپنے تین دوستوں کے ساتھ مرغابی کے شکار کے لیے گیا تھا۔ پوٹھوہار کے دیہاتی علاقے میں کہیں کہیں قدرتی تالابوں میں مرغابیاں تیرتی دیکھیں۔ میرے ایک دوست نے فائر کیا اور ایک مرغابی ماری مگر وہ کنارے سے بہت دُور تھی۔ اسے پانی سے نکالنا ناممکن تھا۔ ہم ایک بڑ کے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ ہمیں کسی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا۔ بڑ کے نیچے دو بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ہنس رہا تھا۔ اُس نے کہا —— "بیٹا تمہارا یہ کارتوس تو ضائع گیا"۔

دوسرا بوڑھا بھی ہنس پڑا۔

یہ مارچ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ ہمیں بھوک نے پریشان کر رکھا تھا۔ ہمارے پاس دس پراٹھے تھے جو ہم شکار کے گوشت کے ساتھ کھانا چاہتے تھے۔ اُس وقت تک ہم پانچ فاختہ اور چار جنگلی کبوتر مار چکے تھے۔ ہم نے اس درخت کے نیچے یہ پرندے روسٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے دو دوست درختوں کی خشک ٹہنیاں اکٹھی کرنے چلے گئے اور ہم دو پرندوں کے پَر اتارنے بیٹھ گئے۔

ایک بوڑھے نے اُٹھ کر ہمارے ہاتھ سے پرندے لے لیے اور

ہمارے ان دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا جو خشک ٹہنیاں اکٹھی کرنے جا رہے تھے۔

"کیوں ہمیں شرمندہ کرتے ہو۔ میرے گھر چلو" ——— بوڑھے نے کہا۔ ہم نے معذرت کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہماری کوئی بات سُنی ہی نہیں، بولا۔ "چلو اٹھو"۔

ہم سب سائیکلیں پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ دوسرا بوڑھا بھی اُٹھا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے کٹی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ایک لاٹھی تھی۔ لاٹھی کے ساتھ اُس نے لکڑی کی ایک تختی سی لگائی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ کپڑوں کی گدّی بندھی ہوئی تھی۔ بوڑھے نے کٹی ہوئی ٹانگ اس گدّی پر رکھ دی اور لاٹھی اُس کی ٹانگ، کا کام دینے لگی۔ وہ بڑے آرام سے ہمارے ساتھ چل پڑا۔ گاؤں دُور نہیں تھا۔ تالاب سے ڈیڑھ دو سو گز دُور ہو گا۔

ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو ایک ٹانگ والا بوڑھا ہم سے جُدا ہو گیا۔ جاتے جاتے اس نے ہمیں پیار سے سلام کیا اور دعائیں دیں۔

دوسرا بوڑھا ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ یہ پکّا مکان تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ کسی اچھے زمیندار کا گھر ہے۔ اس کے بلانے پر دو نوکر آ گئے۔ ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا گیا جس میں بڑے اچھے دو پلنگ بچھے تھے۔ کرسیاں بھی تھیں۔ ہر ایک چیز صاف ستھری تھی۔ بوڑھے نے پرندے اندر بھیج دیئے تھے۔ ہم نے اُسے اپنے پر اٹھے دیئے تو اس نے کہا ——— "یہ اپنے گھر جا کر کھانا"۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے لیے گرم دودھ آ گیا۔ بوڑھے نے کہا ——— "کھانا تیار ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ دودھ پی لو، کچھ سہارا ہو جائے گا"۔

ہم نے دیہات کی مہمان نوازی کے بہت قصّے سُنے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ کسی دیہاتی کے مہمان بنے تھے۔ اس بزرگ نے سارے قصّے سچّے ثابت کر دیئے۔ اس نے کہا ——— "میں نے تمہیں گھر لا کر تمہارا شغل

خراب کر دیا ہے لیکن ہم لوگ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی پردیسی ہمارے گاؤں کے باہر بیٹھ کر اپنا کھانا کھائے"۔

اس بزرگ نے اپنا نام راجہ مدد علی خان بتایا۔

میں نے اس سے دُوسرے بوڑھے کے متعلق پوچھا کہ اس کی ٹانگ کس طرح کٹی تھی۔

"بڑی لمبی کہانی ہے"۔ راجہ مدد علی نے جواب دیا۔

کسی بوڑھے آدمی سے آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ کہانی سناؤ۔ بوڑھے بزرگ ہر وقت کہانیاں سنانے کے ہی موڈ میں رہتے ہیں۔ میرے اصرار یا فرمائش کے بغیر ہی راجہ مدد علی خان نے ایک ٹانگ والے بوڑھے کی کہانی سنانی شروع کر دی۔ اُس کا پورا نام محمد عالم ہے۔ گاؤں والے اسے عالما کہتے ہیں۔ اس سال اس کی عمر اسّی سال ہو گئی ہے۔ راجہ مدد علی اپنی عمر پچاسی سال بتاتے ہیں۔ بہرحال یہ دونوں بزرگ پچھلی صدی کے ہیں۔ راجہ مدد علی نے عالم کی جو کہانی سنائی، وہ انہی کی زبانی سناتا ہوں۔

راجہ مدد علی نے سُنایا کہ ہم جوانی میں کتوں کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ گاؤں کے تقریباً سارے ہی نوجوانوں نے اچھی اچھی نسلوں کے کتے پال رکھے تھے۔ میرے پاس چار کتے تھے۔ مہینے میں ایک دو بار ہم دُور نکل جایا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں اس علاقے میں بھیڑیئے بھی ہوتے تھے۔ گیدڑ تو بہت ہی زیادہ تھے۔ خرگوش بھی ہوتے تھے۔ ذرا یہ علاقہ دیکھو۔ کتنا دُشوار علاقہ ہے۔ کہیں سے بھی ہموار نہیں۔ کہیں سے بہت گہرا ہے کہیں سے بہت اُونچا۔ کہیں ریتلا ہے اور کہیں پتھریلا۔ یہ مٹی کی پہاڑیاں اور سلول کی چٹانیں دیکھو، مگر ہم کتوں کے ساتھ دوڑا کرتے تھے۔ ہمارے لیے یہ چٹانیں اور پہاڑیاں، ریت اور پتھر کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتے تھے۔ عجیب لذّت سی آتی تھی۔ یہی گاؤں تھا لیکن اب گاؤں والے وہ نہیں

— جو ہماری جوانی کے وقت ہوتے تھے۔ ہمارے وقتوں میں لوگ ایک دوسرے پر جانیں بھی قربان کر دیتے تھے۔ کوئی دھوکا اور کوئی فریب نہیں تھا۔

میری عمر اُس وقت اٹھارہ انیس سال تھی۔ میرے سارے دوست اسی عمر کے تھے۔ ایک روز ہم شکار کو نکلے۔ تمہاری طرح پراٹھے ساتھ تھے۔ یہی وقت تھا۔ ہم دوڑ دوڑ کر تھک گئے تھے۔ کتے تو چار پانچ گیدڑ اور اتنے ہی خرگوش کھا چکے تھے۔ ہمارے پیٹ خالی تھے۔ ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ پراٹھے نکالے۔ کوئی گوشت بھون کر لایا اور کوئی مرغی بھون لایا تھا۔ کتے کھلے تھے اور پانی ڈھونڈھ رہے تھے۔ ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں اردگرد مٹی کی اونچی نیچی دیواریں کھڑی تھیں۔ ان میں سے برساتی نالہ گھومتا پھرتا گزرتا تھا۔

ہم کھانا شروع کرنے ہی لگے تھے کہ ہمیں کتوں کے بھونکنے اور غرّانے کی ایسی آوازیں سُنائی دیں جیسے انہوں نے کوئی شکار دیکھ لیا ہو۔ تین چار کتے پانی پی کر ہمارے پاس بیٹھ گئے تھے۔ وہ بھی اُٹھ کر اُدھر کو دوڑ گئے تھے جدھر کتے بھونک رہے تھے۔ وہ جگہ ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہمیں کتوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ سیکھے ہوئے کتے تھے۔ آپس میں نہیں لڑتے تھے۔ ڈر صرف یہ ہوتا تھا کہ پھن دار سانپ کے مقابلے میں نہ آ جائیں۔ اس علاقے میں بڑے لمبے لمبے اور خطرناک ناگ ہوا کرتے تھے۔ انسان تو ان کے ڈنک سے فوراً مر جاتا تھا۔ گھوڑے، بھینس اور بیل جیسے طاقتور جانور بھی دو منٹ میں ختم ہو جاتے تھے۔ ہمارے کتے شکاری تھے۔ دو بار انہوں نے ایسے ہی سانپ کو گھیر لیا تھا۔ اور دو کتے مارے گئے تھے۔ سانپ کے ڈر سے میں اور میرے دو دوست اُٹھے اور کتوں کی طرف گئے۔

ایک جگہ سے مٹی کی پہاڑی کٹی ہوئی تھی اور یہ کٹاؤ گھوم کر اندر کو چلا گیا تھا۔ کتے اس کے اندر تھے۔ ہم اندر گئے تو پہاڑی میں ایک دہانہ نظر آیا۔ ایسے دہانے کے پیچھے بڑا لمبا سوراخ ہوتا ہے جو اندر جا کر چوڑا ہوتا جاتا ہے۔ یہ قدرتی ہوتا ہے۔ اندر جا کر کمرے جتنا کھلا ہو جاتا ہے۔ اس میں گلیاں بھی ہوتی ہیں۔ ایسے غاروں کے اندر بھیڑیئے، گیدڑ، گوہ اور سیہہ رہتے تھے۔ اس دہانے کی چوڑائی اتنی ہی تھی کہ انسان یا کتا رینگ کر اندر جا سکتا تھا۔ ہم سمجھے کہ کتوں نے گیدڑ یا بھیڑیئے کو یا کسی اور جانور کو اندر جاتے دیکھ لیا ہوگا لیکن ایسے دہانے کو دیکھ کر کتے باہر کھڑے نہیں بھونکا کرتے تھے۔

ہمارے تین کتے شکار کو باہر لانے کے ماہر تھے۔ اندر چلے جاتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ کتے دہانے میں منہ لے جاتے اور بھونک کر پیچھے ہٹ آتے تھے۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ دہانے کے اندر کوئی ایسا درندہ ہے جس سے کتے ڈرتے ہیں۔ کتے سخت غصے میں آگے جاتے تھے اور دہانے سے بھاگ آتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر کتے اور شیر ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایسے موقعہ پر ہم ان کی مدد کیا کرتے ہیں۔ میں کلہاڑی لے کر دہانے تک گیا۔ بیٹھ کر اندر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے کلہاڑی اندر کر کے ہلائی تو اندر سے کسی نے کلہاڑی پکڑ کر اتنی زور سے کھینچی کہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں فوراً پیچھے ہٹ آیا۔ دو کتے آگے جانے لگے تو کلہاڑی کا پھل دہانے سے باہر آیا اور دائیں بائیں بڑی زور سے ہلنے لگا۔ کتے پیچھے آ گئے۔

ہم جنوں اور چڑیلوں کے وجود کو برحق مانتے تھے۔ میں اور میرے دوست ڈر گئے کہ یہ کوئی جن ہے لیکن ہم نے سوچا کہ جن ہوتا تو اس طرح نہ کرتا۔ باہر آ کر کتوں کو اور ہم سب کو ختم کر دیتا۔ کوئی درندہ ہاتھ سے کلہاڑی نہیں چھین سکتا تھا، نہ اس طرح ہلا سکتا تھا۔ یہ کوئی انسان

ہی تھا مگر ہمارے کتوں نے کسی انسان پر کبھی حملہ نہیں کیا تھا ۔ ہم صرف جنوں اور چڑیلوں سے ڈرا کرتے تھے اور کوئی چیز، کوئی انسان، کوئی درندہ ہمیں نہیں ڈرا سکتا تھا ۔

کتے اب کلہاڑی سے ڈرتے آگے نہیں جاتے تھے ۔ میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ آگے گیا ۔ دو لڑکے دہانے کے ایک طرف کھڑے ہو گئے ۔ میں دوسری طرف ہو گیا ۔ دو کتے دہانے پر آئے تو کلہاڑی باہر نکلی ۔ میں نے اور میرے ایک دوست نے کلہاڑی پکڑ لی اور باہر کو کھینچنے لگے ۔ اس کے ساتھ دو انسانی ہاتھ باہر آ گئے جنہوں نے کلہاڑی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا ۔ ہم نے ایک ایک ہاتھ سے اس کی کلائیاں پکڑ لیں ۔ ہاتھ بڑے آدمی کے نہیں بلکہ کسی کمسن لڑکے کے تھے ۔ اندر سے رونے کی آواز آئی ۔ ہم نے اس کی کلائیوں کو کھینچا اور میرے ایک دوست نے کہا کہ زندہ رہنا ہے تو باہر آ جاؤ ۔ تمہارے پیچھے غار میں بھیڑیئے رہتے ہیں ۔ ہمیں دہانے سے سر اور چہرہ باہر نکلتا نظر آیا ۔ ہمارے دل دھک دھک کرنے لگے ۔ یہ ظاہری طور پر انسان تھا مگر یہ کوئی شر شرار بھی ہو سکتا تھا ۔ ہم نے اُس کے ہاتھ چھوڑ دیئے ۔

وہ پیٹ پر رینگ کر باہر آ گیا ۔ کتے بھونک کر اُس پر حملہ کرنے لگے تو وہ چیخ مار کر میرے ساتھ لپٹ گیا ۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا ۔ وہ بارہ تیرہ سال کی عمر کا دیہاتی لڑکا تھا ۔ خوف سے کانپ رہا تھا اور رو رہا تھا ۔ میرے دوستوں نے کتوں کو قابو کر لیا ۔ میں نے لڑکے کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ میرے پاؤں میں گر پڑا ۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ـــــ "تم مجھے مار دو گے ۔ اپنے اللہ کے واسطے مجھے بھاگ جانے دو ۔ وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں ۔ مجھے اُلٹا لٹکا کر مار ڈالیں گے ۔ مجھے بھاگ جانے دو ۔"

ہم نے اُسے بہت تسلیاں دیں اور کہا کہ ہمارے ہاتھ سے تمہیں کوئی پکڑ کر نہیں لے جا سکتا ۔ کسی کی جرأت نہیں کہ تمہیں ہاتھ بھی لگائے ۔

اُس نے کھدر کی چھوٹی سی چادر باندھ رکھی تھی ۔ کھدر کا بہت پرانا کرتہ تھا اور سر پر کھدر کا ہی گز ڈیڑھ گز صافہ لپیٹ رکھا تھا ۔ پاؤں سے ننگا تھا ۔ چہرہ لاش کی طرح بے رنگ اور آنکھیں کھوپڑی میں اتری ہوئی تھیں وہ ڈر سے اور سردی سے کانپتا ہوا ہمارے ساتھ چل پڑا ۔

ہم نے اُسے اپنے دوستوں میں جا بٹھایا ۔ وہ کھانے کے لیے ہمارا انتظار کر رہے تھے ۔ لڑکے کو بھی ہم نے کھانے پر بٹھا لیا ۔ تین چار منٹوں میں وہ اتنے موٹے موٹے پراٹھے اور کوئی آدھا سیر گوشت کھا گیا ۔ کھاتے وقت اُس نے اوپر نہیں دیکھا ۔ کھانے کے فوراً بعد وہ ذرا پرے ہو کر پیٹھ کے بل لیٹ گیا اور ایک سیکنڈ میں گہری نیند سو گیا ۔ وہ ضرور بہت دُور سے آیا تھا اور تین چار دنوں کا بھوکا لگتا تھا ۔ ہم نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ اسے اپنے گاؤں لے چلیں گے اور اگر لاوارث ہُوا تو اسے گاؤں میں رکھ لیں گے ۔

اُس نے نیند میں بولنا شروع کر دیا ۔ تم حساب کرو یہ کم و بیش ستر سال پرانی بات ہے پھر بھی مجھے اُس کی خواب کی باتیں آج بھی یاد ہیں ۔ وہ سر زور زور سے دائیں بائیں ہلاتا تھا اور کہتا تھا ـــــ "نہ مارو ۔ اس کو نہ مارو ۔ میں تم کو پیسے دے دُوں گا ۔ دیکھو لوگو ۔ میری بہن کو مارتے ہیں ۔ چھڑاؤنا ، چھڑاؤنا" ..... پھر اُس نے خواب میں رونا شروع کر دیا اور پھر چُپ ہو گیا ۔ وہ بہت گہری نیند سویا ہوا تھا ۔ کچھ دیر بعد وہ پھر ایسی ہی باتیں کرنے لگا اور پھر رو کر چُپ ہو گیا ۔

ہم نے اُسے جگایا نہیں ۔ سب کہنے لگے کہ اسے نیند پوری کرنے دو ۔ ہم بہت تھک گئے تھے ۔ سب سو گئے ۔ میرا خیال ہے کہ تین گھنٹے ہم سوئے رہے ۔ مجھے اُس لڑکے نے جگایا اور آہستہ سے کہنے لگا ـــــ "سب سو رہے ہیں ۔ میں بھاگ جاؤں ؟" ـــــ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ـــــ "میں نہیں بھاگا تو وہ آ جائیں گے" ۔ اور وہ

زار و قطار رونے لگا۔

میں نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ تم بھاگو نہیں ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ ہمارے پاس رہے تو کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اپنے دوستوں کو جگا لیا اور گاؤں کی طرف چل پڑے۔ لڑکا بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں ہم نے اس سے نام پوچھا۔

"محمد عالم، مجھے عالما کہتے ہیں"۔ اُس نے بتایا "کوئی تم سے پُوچھے کہ عالما ادھر تو نہیں آیا؟ تم کہنا کہ ہم عالمے کو نہیں جانتے"۔۔۔ اُس نے اپنے گاؤں کا نام بھی بتایا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں تھا جسے اُس وقت ڈھوک کہتے تھے۔ عرصہ ہوا وہ گاؤں اُبڑ گیا ہے۔

ہم اپنے گاؤں میں آئے۔ میں عالم کو اپنے گھر لے آیا۔ اپنا زمیندارہ اچھا تھا۔ مال مویشی بھی زیادہ تھے۔ دو نوکر موجود تھے۔ ایک اور رکھا جا سکتا تھا۔ گاؤں کے نوکر دو وقت کی روٹی، ضرورت کے مطابق کپڑا، عید پر نیا جوڑا اور سر چھپانے کے لیے جگہ مانگتے تھے۔ پیسے دے دیئے تو انہوں نے لے لیے، مانگتے نہیں تھے۔ ہمارے نوکر گھر کے فرد بن جاتے تھے۔ ہم ان کی شادی بھی کرا دیتے تھے۔ اب وہ بات نہیں رہی۔

میرے والد صاحب مرحوم نے عالم کو گھر رکھنے کی اجازت دے دی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بستر میں سُلا دیا۔ شام کے بعد جاگا۔ میرے دوست آ گئے۔ عالم کو ہم نے درمیان میں بٹھا لیا اور پوچھا کہ وہ گھر سے کیوں بھاگا ہے۔

اُس نے کرتہ اُوپر کیا۔ چادر کا ایک پلّو کھول کر اُس نے ردپے روپے کے گیارہ سکے اور پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر ہمیں دکھایا۔ کہنے لگا کہ یہ ایک گھر سے چوری کیے تھے۔ گھر والوں کو اس پر شک ہوا اور اسے پکڑنے آئے۔ عالم کو پہلے پتہ چل گیا۔ وہ چھت پر چڑھ گیا اور پچھواڑے سے کُود کر بھاگ آیا۔ لوگوں کو اُس وقت پتہ چلا جب

وہ بہت دُور نکل گیا تھا۔ وہ زمانہ ٹٹوؤں اور گھوڑوں کا تھا۔ گاؤں کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو تین چار گھوڑے ضرور ہوتے تھے۔ عالم کے پیچھے دو گھوڑے دوڑائے گئے۔

وہ علاقہ ہمارے علاقے سے زیادہ پہاڑی تھا۔ عالم ایک چٹان پر چڑھ گیا اور بیریوں کی جھاڑیوں میں لیٹ گیا۔ دونوں گھوڑ سوار اس کے نیچے سے گذر گئے۔ وہ نشیب میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو عالم دوسری طرف دوڑ پڑا۔ علاقہ ایسا تھا کہ اسے کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ کھڈوں اور نالوں میں چھُپ چھُپ کر چلتا رہا۔ اسے ایک جگہ سے بہت دور گھوڑے واپس جاتے دکھائی دیے۔

وہ اپنے گاؤں سے بہت دور نکل آیا تھا۔ سارا دن چلتا رہا۔ شام کے بعد ایک گُف میں سو گیا۔ سُورج نکلنے کے بعد جاگا اور چل پڑا۔ اسے جہاں کوئی گاؤں نظر آتا تھا وہاں سے دُور چلا جاتا تھا۔ بھُوک اور تھکن نے اس کی جان نکال دی تھی۔ راستے میں اس نے کئی کھیتیوں میں چھولیا دیکھا لیکن اس ڈر سے قریب نہ گیا کہ کسی نے پکڑ لیا تو پیسوں کی چوری بھی پکڑی جائے گی۔ بارہ تیرہ سال عمر ہوتی ہی کیا ہے۔ اس عمر میں بچے ماؤں کی گودیوں میں کھیلتے ہیں۔ یہ بچہ ایسی سرد راتوں میں ان جگہوں میں سوتا رہا جہاں بھیڑیئے اور سانپ ہوتے ہیں۔

وہ بہت ڈرتا تھا لیکن پکڑے جانے کا ڈر زیادہ تھا۔ وہ روتا رہا اور چلتا رہا۔ جب ٹانگیں جواب دینے لگیں تو تھوڑا سا چل کر کہیں چھُپ کر بیٹھ جاتا۔ پھر ایک اور رات آ گئی جو اُس نے ایک اور گُف میں گزاری۔ تیسرا دن چڑھا۔ اب تو اس سے اُٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ بھُوک، تھکن اور سردی نے اُسے لاش بنا دیا۔ وہ بہت دیر دھوپ میں بیٹھا رہا۔ جسم ذرا گرم ہوا تو چل پڑا۔

گرتے پڑتے، قدم گھسیٹتے وہ اس برساتی نالے میں سے گزر رہا

تنہا جہاں ہمارے کتے پھر رہے تھے ۔ ہم وہاں سے ذرا دور ہی بیٹھے
تھے ۔ عالم اُس طرف جا رہا تھا جو ہمیں وہاں سے نظر نہیں آتی تھی ۔ اُس
نے ہمیں نہیں دیکھا تھا ۔ وہاں آکر وہ اس جگہ چھپ گیا جہاں سے مٹی
کی پہاڑی کٹی ہوئی تھی ۔ اس کی تھکن کا اب یہ حال تھا کہ وہ ایک قدم
بھی نہیں چل سکتا تھا ۔ وہ بیٹھ گیا ۔

ہمارا ایک کتا گھومتے پھرتے اس کے قریب گیا تو اُس نے ڈر کر
کتے کو پتھر مارا ۔ یہ ہمارا لڑاکا کتا تھا ۔ اسے غصہ آگیا ۔ وہ عالم پر غرّایا ۔ عالم
سے چلا نہیں جاتا تھا ۔ وہ بچّہ تھا ۔ وہ دُودھ پیتے بچوں کی طرح ہاتھوں
اور گھٹنوں کے بل دوڑ پڑا ۔ کتوں کو اس سے شک ہوا کہ یہ کوئی جانور
ہے ۔ وہ اس کے پیچھے گئے ۔ قریب غار کا دہانہ تھا ۔ عالم اس میں گھس
گیا ۔ کتے غار کے مُنہ میں جانے لگے تو عالم نے انہیں ڈرانا شروع کر دیا ۔
اتنے میں ہم پہنچ گئے ۔ میں نے جب کلہاڑی اندر کی تو عالم نے مرنے یا
مارنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اُس نے میرے ہاتھ سے کلہاڑی چھین لی ۔ اُس
نے ہمیں سنایا کہ اس کے ہاتھ سے ہم کلہاڑی چھین نہ لیتے تو وہ ہم میں
سے کسی کو یا کتوں کو کاٹ کر رکھ دیتا —— پھر ہم نے اسے باہر نکال لیا ۔

عالم نے یہ رقم اپنی بہن کی عزت بچانے کے لیے چوری کی تھی ۔ اس
کی عمر نو سال تھی جب اس کا باپ مر گیا ۔ باپ غریب آدمی تھا ۔ اس کی
ایک گائے اور ایک گدھی تھی جنہیں وہ ہل کے ساتھ جوتا کرتا تھا ۔ وہ
دوسروں کی کھیتیوں میں بٹائی پر کام کرتا تھا ۔ اکیلا آدمی ایک ہل سے
کتنی زمین میں کاشت کاری کر سکتا تھا ۔ کسی نے اسے صرف زندہ رکھنے
کے لیے اپنی ڈیڑھ دو ایکڑ زمین دے دی تھی ۔ وہ مر گیا ۔

عالم کی عمر صرف نو سال تھی ۔ اس کی ایک بہن بھی تھی جس کی اس
وقت عمر چودہ پندرہ سال تھی ۔ اچھی شکل و صورت کی لڑکی تھی ۔ اس کی
ماں نے پہلے گائے اور گدھی بیچی ، پھر کھاتے پیتے گھروں میں کام کرنے

لگی ۔ اس کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے ، اسے کہیں
بیاہ دے لیکن ایک سال بعد ماں بھی مر گئی ۔

عالم کی عمر دس سال ہو گئی تھی ۔ اس کی پرورش بہن کے ذمّے ہو گئی ۔
ان کا کوئی اور قریبی رشتہ دار نہیں تھا ۔ وہ زمانہ خلوص اور محبّت کا تھا مگر
لڑکی جوان ہو ، خوب صُورت ہو اور دُنیا میں وہ بے آسرا رہ جائے تو
کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی نظریں پھر جاتی ہیں ۔ عالم کی بہن نے ماں کی جگہ
دو تین گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا ۔ وہ زمانہ تعلیم کا نہیں تھا ۔ عالم
اَن پڑھ رہا ۔ یہ کوئی عیب نہیں تھا ۔ وہ دوسروں کے مویشی چرانے لگا ۔

بہن بھائی جو ماں باپ کی زندگی میں پیار کی فضا میں بہت خوش
رہتے تھے اور کبھی غربت کا احساس نہیں ہوا تھا ، اب اس طرح رہنے
لگے کہ صبح کے وقت دونوں جدا ہوتے تو رات کے وقت ایک دُوسرے
کی شکل دیکھتے ۔ ان کا چولہا ٹھنڈا رہنے لگا ۔ انہیں جہاں کہیں سے روٹی
مل جاتی کھا لیتے تھے ۔ کسی نہ کسی گھر سے انہیں روٹی مل ہی جاتی تھی ۔
کپڑے بھی لوگ دے دیتے تھے ۔ ان کا اپنا صرف کچّا سا ایک مکان تھا
جو ایک کمرے کی جھگی تھی ۔ یہاں وہ سونے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے ۔

عالم کی بہن اکثر رویا کرتی تھی ۔ عالم بھی روتا تھا لیکن اُسے یہ احساس
ہو گیا کہ وہ مرد ہے ، اسے نہیں رونا چاہیئے ۔ ایک روز اُس نے
بہن سے کہا کہ تم نہ رویا کرو ۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں ۔ تم سے کام چھڑا
دوں گا ۔ میں کسی کی زمین بٹائی پر سنبھال لوں گا —— وہ گیارہ سال
کی عمر میں بڑی عمر کا آدمی بن گیا لیکن وہ ہل چلانے کے لیے مویشی نہ خرید
سکا اور اگر خرید بھی لیتا تو وہ کھیتی باڑی کا کام نہیں کر سکتا تھا ۔

اُس کی بہن جوان تھی ۔ عقل کی بات سوچ سکتی تھی ۔ اس نے سوچا
کہ عالم بچّہ ہے ۔ صبح سے شام تک مویشیوں کے پیچھے جانے کہاں
کہاں بھاگتا رہتا ہے ۔ کھانے کو اسے لوگوں کے گھروں سے دال

ساگ مل جاتا ہے لیکن اسے کبھی دودھ کا گھونٹ نصیب نہیں ہوا ۔ اسے مرد بننا ہے ، اس کے جسم میں جان ہونی چاہیئے ۔ یہ سوچ کر اس نے ایک گائے خرید لی ۔

اب تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ اس نے دودھ والی گائے پندرہ روپوں میں خریدی تھی ۔ اُس وقت کے پندرہ روپے آج کے پانچ سو روپے کے برابر ہوتے تھے ۔ ذرا تصور کرو کہ اُس زمانے میں مزدور دو پیسے "دیہاڑی" پر کام کیا کرتا تھا ۔

عالم کی بہن نے گائے خرید لی لیکن اُدھار خریدی ۔ اسے امید تھی کہ جن گھروں میں وہ کام کرتی ہے وہاں سے تھوڑے تھوڑے پیسے لے کر سال چھ ماہ میں قیمت ادا کر دے گی ۔ عالم کو بہن دودھ پلانے لگی۔

ایک شام عالم گھر آیا تو وہاں گاؤں کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا ۔ وہ اونچی ذات کا زمیندار تھا ۔ گائے اسی سے خریدی گئی تھی ۔ وہ چارپائی پر بیٹھا تھا اور عالم کی بہن زمین پر ۔ وہ لڑکی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا ۔ عالم گھر میں داخل ہوا تو اس آدمی نے جس کا نام ہاشم تھا، عالم کو سینے سے لگا لیا اور اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا ۔ اس نے عالم اور اُس کی بہن سے بڑے پیار سے باتیں کیں ۔

وہ جانے لگا تو لڑکی نے اسے کہا کہ راجہ جی ، جب سے گائے لائی ہوں آپ کو ایک پیسہ نہیں دے سکی ۔ مجھے کہیں سے پیسے ملے نہیں ۔ اگلی عید پر شاید روپیہ ڈیڑھ ہاتھ آ جائے ۔

ہاشم نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ پیسوں کا غم نہ کرو ۔ گائے یہاں بندھی رہے چاہے میرے گھر میں ایک ہی بات ہے ۔ پیسوں کی بات اُس روز کرنا جس روز میں کہوں گا کہ پیسے دو ——— وہ چلا گیا ۔

بہن بھائی خوش تھے کہ انہیں ایک ہمدرد مل گیا ہے ۔ تین چار

روز بعد بہن نے عالم کو یہ خوشخبری سنائی کہ گائے کی قیمت ادا کرنے کا بندوبست ہو گیا ہے ۔ بندوبست یہ ہوا تھا کہ وہ ہاشم کے گھر کام کاج کر آیا کرے اور گائے کی قیمت اسی میں ادا ہو جائے گی ۔ گاؤں میں سب سے بڑا کام یہ ہوتا تھا کہ مویشیوں کا گوبر اکٹھا کر کے اُپلے بنا دینا اور جب سُوکھ جائیں تو اکٹھے کر دینا ۔ برتن دھونا ، گھر کی عورت کی مٹھی چاپی اور دہی بلونا ۔

ہاشم کی بیوی بُدھو اور موٹی بھدی سی عورت تھی ۔ زیادہ وقت لیٹی رہتی تھی ۔ عالم کی بہن وہاں گئی تو اس عورت نے سارا گھر اس کے حوالے کر دیا ——— اور تھوڑے ہی دنوں بعد پتہ چلا کہ اس عورت نے اپنا خاوند بھی اس لڑکی کے حوالے کر دیا ہے ۔

گرمیوں کی دوپہر ہاشم کی بیوی اندر سو جاتی اور ہاشم عالم کی بہن کو اپنے کمرے میں بُلا لیتا ۔ یہ کمرہ صحن سے آگے ڈیوڑھی کے ساتھ تھا ۔ وہ اس سے مٹھی چاپی کراتا ۔ لڑکی سادگی سے اس کا سر اور ٹانگیں دباتی رہتی ۔ لڑکی نے کچھ عرصہ بعد جو واقعہ بتایا وہ اس طرح ہوا کہ ایک دوپہر وہ ہاشم کے پلنگ پر بیٹھی اس کا بازو دبا رہی تھی ۔ اسے اونگھ آ گئی ۔ ہاشم نے پلنگ پر سرک کر اس کے لیے جگہ بنا دی اور اسے اپنے پاس لٹا لیا ۔ لڑکی شرمائی ۔ اُٹھنے کی کوشش کی مگر ہاشم نے اسے بہلا پھسلا کر اور شفقت کا دھوکا دے کر اپنے پاس لٹا لیا ۔

اُس وقت لڑکی سترہ اٹھارہ سال کی ہو گئی تھی ۔ لڑکی کو جوانی کی نیند نے دبا لیا ۔ اس کی آنکھ کھلی تو ہاشم کمرے میں کھڑا تھا ۔ لڑکی کا خوف دور ہو گیا ۔ اسے یقین ہو گیا کہ ہاشم نیک آدمی ہے ۔

دو روز بعد اور پھر دو روز بعد ، دو دفعہ ایسے ہی ہوا کہ لڑکی نیند سے مجبور ہو کر ہاشم کے پاس لیٹ گئی اور سو گئی ۔ ہاشم نے کوئی نازیبا حرکت نہ کی ۔ لڑکی باپ کی شفقت کو ترسی ہوئی تھی ۔ اسے کوئی شک نہ ہوا ۔ عالم

کو تو اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں تھا ۔ وہ گائے کا دودھ پی رہا تھا اور کچھ دُودھ بچ رہتا جسے وہ جما کر مکھن نکال لیتے تھے ۔

جس روز عالم ہمیں ملا اس سے دس بارہ روز پہلے کا واقعہ ہے کہ عالم گاؤں سے کچھ دور دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے سویا ہوا تھا ۔ مویشی بھی اِدھر اُدھر سائے میں بیٹھ گئے تھے ۔ گاؤں کے دو لڑکوں نے اُسے جگایا اور بتایا کہ تمہاری بہن نے معلوم نہیں کیا کیا ہے، ہاشم اسے مار رہا ہے اور عورتیں تمہاری بہن کو گالیاں دے رہی ہیں ۔

عالم بہت ہی تیز دوڑتا ہوا گاؤں پہنچا ۔ گاؤں کے تمام آدمی اور عورتیں باہر نکل آئے تھے ۔ ہاشم نے اس کی بہن کو بازو سے پکڑا ہوا تھا اور دو عورتیں لڑکی کو تھپڑ اور گھونسے مار رہی تھیں ۔ باقی عورتیں گالیاں بک رہی تھیں ۔ عالم کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا ۔ اس نے غصّے سے پاگل ہو کر اپنی بہن کو مارنے والی ایک عورت کی پیٹھ پر ڈنڈا مارا ۔ پیچھے سے کسی نے اس کے کان پہ ایسا تھپڑ جمایا کہ عالم تیورا کر گرا ۔ پھر اسے کسی نے اٹھنے نہیں دیا ۔ اسے مار مار کر بے ہوشی تک پہنچا دیا گیا ۔ اسے ہر تھپڑ، گھونسے اور لات کے ساتھ ایک ہی آواز سنائی دیتی تھی ——— ”اور مارو کمین ذات کو ۔ ہمارا جھوٹا کھا کر ہم پر ہاتھ اُٹھاتا ہے“ ۔

اور عورتیں چڑیلوں کی طرح چیخ رہی تھیں ——— ”جان سے مار دو حرامزادی کو ۔ جوانی پھٹ رہی ہے اس کی ۔ اونچی ذات کے مردوں کے پاس سوتی ہے“ ۔

بہن بھائی کس طرح اپنے گھر پہنچے ۔ گھر میں انہوں نے ایک دوسرے کو کس طرح دیکھا ، کس طرح بہلایا اور وہ ایک دوسرے کو گلے لگا کر کس طرح روئے ، بہت ہی دردناک قصّہ ہے ۔ عالم کو تو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا ۔ اسے بعد میں پتہ چلا کہ اس کی بہن کو دوپہر کے وقت ہاشم نے اپنے پاس لٹا لیا تھا ۔ اس کی بیوی مُرداروں کی طرح

دوسرے کمرے میں سوئی رہتی تھی ۔ اُس روز بدبختی یہ ہوئی کہ وہ صحن میں نکل آئی ۔ ادھر ہاشم نے پہلی بار یہ حرکت کی کہ سوئی ہوئی لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لے کر ساتھ لگا لیا ۔ لڑکی کی آنکھ کھل گئی ۔ وہ گھبرا گئی اور اُس کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی ۔

ہاشم پر شیطان سوار ہو چکا تھا ۔ وہ اسے چھوڑ نہیں رہا تھا ۔ لڑکی بڑی مشکل سے اُس کے بازوؤں سے نکل گئی ۔ وہ اُٹھ رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا ۔ ہاشم نے اپنی بیوی کو دیکھ لیا ۔ اس نے عالم کی بہن کو زور سے دھکّا دیا اور گالی دے کر کہا ——— ”کمین کی بچّی ۔ تیری یہ جرأت کہ میرے ساتھ سونا چاہتی ہے ؟ ناپاک کرنا تھا تو تجھے اپنی ذات کا کوئی مردار نہیں ملا ؟“ ——— وہ غصّے سے اُٹھا اور بیوی سے کہا ——— ”مار جُوتے اس کتیا کو ۔ باہر لے چل اسے ۔ میری آنکھ لگ گئی تو میرے اُوپر لیٹ گئی ۔ اچھا ہوا کہ میری آنکھ کھل گئی“ ۔

پھر قیامت آ گئی ۔ اس قیامت میں نیچ ذات کی کون سنتا تھا ۔ سب نے کہا کہ نیچ لڑکی نے اُونچی ذات کے مرد کے پاس لیٹنے کی کوشش کی تھی ۔

دو روز تو بہن بھائی باہر نہ نکلے ۔ شام کو ہاشم اُن کے گھر گیا ۔ عالم تھا تو بارہ تیرہ سال کا بچّہ لیکن بہت کچھ سمجھتا تھا ۔ اسے بھی اپنی بہن پر شک تھا کہ اس نے ایسی حرکت کی ہو گی ۔ ہاشم ان کے گھر میں داخل ہوا تو عالم صحن میں تھا ۔ اس سے ہاشم نے پوچھا کہ بہن کہاں ہے ؟ اس نے بتایا کہ اندر ہے ۔ ہاشم اندر چلا گیا ۔ عالم کی بہن اس پر برس پڑی ۔ عالم دروازے میں جا کھڑا ہوا ۔ وہ حیران تھا کہ ہاشم خاموش تھا اور اس کی بہن اُس پر چلّا رہی تھی ——— ”میرے ساتھ مسجد میں کھڑا ہو کر کہہ کہ میں تیرے پاس لیٹنا چاہتی تھی ۔ تُو راجہ بنا پھرتا ہے ۔ اگلے جہان خدا کو کیا جواب دے گا ؟ چل مسجد میں اور چار مَردوں کے سامنے میں قرآن ہاتھ میں رکھ کر کہوں گی کہ اس پاپی نے مجھے زبردستی اپنے پاس لٹایا اور میرے ساتھ

بدنیتی کی تھی"۔

ہاشم آہستہ آہستہ اسے کہہ رہا تھا ——— "اچھا، میں ہی گناہگار سہی۔ اب چپ ہو جا۔ جو ہوا سو ہوا، میں سنبھال لوں گا۔"

یہ معاملہ دیکھ کر عالم کا شک رفع ہو گیا۔ اس کا خون کھولا مگر وہ بچہ تھا اور کمین ذات کا یتیم بچہ تھا۔ جسم ابھی تک درد کر رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اس کی بہن واہی تباہی بکتی رہی۔ ہاشم اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر اس کا راجہ پن جاگ اٹھا۔ اس نے لڑکی کو دھمکی دی کہ اس نے زبان کھولی تو وہ اسے اغوا یا قتل کرا دے گا، پھر اس نے کہا کہ گائے کے پیسے دو ورنہ سارے گاؤں میں بے عزتی کروں گا۔

عالم نے اسے کہا ——— "تم اپنی گائے لے جاؤ۔ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

ہاشم نے اسے تین چار گالیاں دے کر کہا۔ "اتنا عرصہ جو دودھ مکھن نگلتے رہے ہو اس کا حساب تمہارا باپ چکائے گا؟" ——— یہ کہتے کہتے وہ باہر نکل گیا۔

باہر تین چار آدمی کھڑے تھے۔ انہیں سنانے کے لیے ہاشم نے کہا ——— "اب نیچ ذات گائے کے پیسے دبانا چاہتی ہے۔ اندر پیسے رکھے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں بدکار کس سے لیتی ہے پیسے؟"

بہن بھائی کلیجے تھام کے رہ گئے۔

وہاں سے عالم کا دماغ پھر گیا۔ غریب کا بچہ کسی کی گردن تو نہیں کاٹ سکتا، جیب کاٹ لیا کرتا ہے۔ اس نے ترکیب سوچ لی۔ وہ گاؤں کے جو مویشی باہر لے جایا کرتا تھا، اس میں ہاشم کے مویشی بھی ہوتے تھے۔ انہیں لے جانے اور واپس لانے کے لیے وہ ہاشم کے گھر جایا کرتا تھا۔ اس کی بہن تو اب گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے کسی گھر میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

عالم کو معلوم تھا کہ ہاشم کی بیوی بہت کاہل ہے۔ اپنے ہاتھوں پانی بھی نہیں پیتی۔ اس نے جو ترکیب سوچی تھی اس کے مطابق اس نے اس عورت کے گھر کے بھی کچھ کام کرنے شروع کر دیئے۔

ایک روز یہ عورت صحن میں لیٹی ہوئی تھی۔ عالم اس کی ایک بھینس کو واپس لایا اور کھرلی سے باندھ دیا۔ ہاشم کی بیوی نے اسے کہا کہ اندر جاؤ اور تھوڑا سا گڑ نکال لاؤ۔ اس نے اسے بتایا کہ کمرے کے کونے میں اوپر نیچے چار ہانڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اوپر سے دوسری میں گڑ ہے۔ اس گڑ میں اس عورت نے بادام اور ناریل وغیرہ ملایا ہوا تھا۔

عالم نے ایک ہانڈی اٹھائی تو نیچے والی میں گڑ تھا۔ اس نے گڑ کا ایک ڈھیلا اپنی چادر میں اڑس لیا اور ایک ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے یہ ہانڈی بھی اٹھائی۔ اکثر عورتیں اس قسم کے برتنوں میں پیسے رکھا کرتی تھیں تاکہ چوری ڈاکہ پڑے تو کسی کو شک نہ ہو کہ پیسے ہانڈی میں رکھے ہوئے ہیں۔ عالم نے تیسری ہانڈی دیکھی تو اس میں گیارہ روپے کے سکے اور ایک پانچ کا نوٹ پڑا دیکھا۔ اس نے جلدی جلدی سے یہ رقم اپنی چادر کا پلو کھول کر باندھ لی۔ اوپر کرتہ تھا۔

اس نے گڑ کا ڈھیلا ہاشم کی بیوی کو دیا اور باہر نکل گیا۔ اس نے کبھی چوری نہیں کی تھی۔ یہ اس کی انتقامی کارروائی تھی۔ وہ بچہ تھا آگے کی نہ سوچ سکا۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ چوری کر کے ہاشم کو پندرہ روپے دے دے گا۔ اسے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ چوری اتنی آسانی سے ہو جائے گی۔ وہ اچانک ہو گئی۔ اب اس کا دماغ سوچنے سے معذور ہو گیا۔ وہ یہی کچھ سوچ سکا کہ وہ دو تین روز رقم چھپائے رکھے گا اور ہاشم کو دے دے گا کہ یہ لو گائے کی قیمت۔

اس نے بہن کو بتا دیا۔ بہن نے اسے بہت گالیاں دیں اور کہا کہ یہ پیسے وہیں رکھ آؤ۔ اس نے اسے یہ طریقہ بھی بتایا کہ ہاشم کی بیوی

سے جاکر گڑ مانگو۔ وہ کاہل عورت ہے۔ کہے گی کہ اندر سے جاکر لے لو۔ پھر تم اندر جاکر یہ رقم وہیں رکھ دینا جہاں سے اٹھائی تھی مگر عالم ڈرتا تھا کہ پکڑا جائے گا اور وہ انتقام بھی لینا چاہتا تھا۔ وہ نہ مانا۔ بہن نے اُسے ڈرایا اور کہا کہ چوری تو پکڑی ہی جائے گی پھر لوگ تمہیں مار مار کر ہڈیاں توڑ دیں گے۔ مجھ پہ لوگ پہلے ہی بڑا غلیظ الزام لگا چکے ہیں۔ اب وہ ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

عالم سوچ میں پڑ گیا۔ وہ پیسے واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سوچ سوچ کر اس نے بہن سے کہا ــــ "سنو جیجو۔ میں مرد ہوں۔ تم عورت ہو۔ میری عزت ہو۔ میں پیسے واپس نہیں کروں گا۔ تمہیں اس گاؤں میں نہیں رہنے دُوں گا۔ میں تمہاری عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں عزت کی زندگی دُوں گا۔ تمہیں عزت دار گھر بنا دوں گا یا اپنے ہاتھوں قبر میں اتار دُوں گا۔"

عالم آج تک حیران ہے کہ اس کچی عمر میں ایسے سخت الفاظ اس کی زبان سے کس طاقت نے کہلوائے تھے۔ وُہ کہتا ہے کہ اُس نے بکواس نہیں کی تھی۔ سینے سے ایک اُبال اُٹھا تھا اور یہ لفظ مُنہ سے نکل گئے اور پھر کسی نے مجھے کہا کہ عالمے، اب تم مرد بن کر دکھاؤ اور زبان کا بول پورا کرکے دکھاؤ۔

اس سے تھوڑی ہی دیر بعد کا واقعہ ہے کہ عالم کی بہن باہر نکلی تو اسے ہاشم آتا نظر آیا۔ اُس کے ساتھ اس کی بیوی اور ایک اور آدمی تھا۔ ہاشم کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ اُس نے دُور سے گالی دی اور کہا ــــ "باہر نکال اس ڈاکو کو۔"

چوری پکڑی گئی تھی۔

بہن دوڑ کر اندر آئی۔ عالم سے کہا ــــ "بدبخت وہ آرہے ہیں۔ انہیں پتہ چل گیا ہے۔"

عالم نے کھلے دروازے سے دیکھا، ہاشم، اُس کی بیوی اور ایک آدمی تیز تیز چلتے آرہے تھے۔ اُس نے بہن سے کہا ــــ "جیجو اللہ بیلی۔ تمہیں لینے آؤں گا، اپنی عزت سنبھال کر رکھنا۔"

وہ پہلو کی دیوار پر چڑھا۔ وہاں سے چھت پر گیا۔ وہاں سے اُس نے بازو پھیلا کر ہاشم کو للکار کر کہا ــــ "ہاشمے! مرد ہو تو میری بہن کو ہاتھ نہ لگانا۔ آؤ، مجھے پکڑو۔ تمہاری رقم میرے پاس ہے۔ میں مرد ہوں" ــــ اس نے پچھواڑے سے چھلانگ لگائی اور پیشتر اس کے کہ لوگ گھوم کر پہنچتے، عالم بہت دُور نکل گیا تھا۔

عالم نے ہمیں یہ واردات سنائی تو اُس کے آنسو نکل آئے۔ ہمیں اس پر بہت ترس آیا اور میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کی بہن پیچھے اکیلی رہ گئی ہے۔ اس کا وہ لوگ معلوم نہیں کیا حال کرتے ہوں گے۔ ہم جوانی کے جوش میں آکر یہ کر سکتے تھے کہ تین چار آدمی اس کے گاؤں جاکر لڑکی کو نکال لاتے لیکن اُس زمانے میں اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہوتے تھے۔ بات خون خرابے اور خاندانی عداوت تک پہنچ جاتی تھی، پھر بھی ہم آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ اس کی بہن کو وہاں سے کس طرح نکالا جائے۔

عالم نے کہا ــــ "میں ساری عمر اس شخص کی خدمت کرتا رہوں گا جو میری بہن کو وہاں سے لے آئے۔"

ہم مجبور تھے لیکن اس مسئلے کو ذہن سے نکالا نہیں۔ عالم کو میں نے اپنے گھر رکھ لیا۔ اسے اچھے کپڑے، رہنے کو اچھی جگہ اور کام معمولی سا دیا لیکن وہ ہر وقت بے چین رہتا تھا۔ میں نے اسے روتے بھی دیکھا۔ میں اسے تسلی دلاسا دیتا تھا تو وہ میری منت کرتا تھا کہ اس کی بہن کو لانے میں اس کی مدد کروں۔ میں جھوٹا سچا وعدہ کر دیتا تھا۔ وُہ کہتا تھا کہ میں دن کے وقت گاؤں میں داخل نہیں ہو سکتا ورنہ وہ لوگ

مجھے ماریں گے اور تھانے چھوڑ آئیں گے۔ وہ یہ الفاظ تو دن میں دس بار کہتا تھا ——— "میں بہن کو عزت دار گھر میں بساؤں گا یا اسے اپنے ہاتھوں قبر میں اتار دوں گا"۔

اسے ہمارے گاؤں میں آئے ہوئے ساتواں یا شاید آٹھواں روز تھا کہ صبح اُٹھے تو عالم غائب تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری کلہاڑی اور ہماری گھوڑی بھی غائب تھی۔ میرے دل میں پہلا خیال یہ آیا کہ عالم اپنی بہن کو لینے چلا گیا ہے لہٰذا عالم بھی مرا اور گھوڑی بھی ہمیشہ کے لیے گئی۔ تیرہ سال کی عمر کا بچّہ یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ دن کے وقت گاؤں میں داخل نہیں ہو گا کیونکہ لوگ اسے پکڑ کر مارتے بھی اور گھوڑی بھی چھین لیتے۔ مجھے ڈر تھا کہ اس نے دن کے وقت گاؤں میں جانے کی دلیری کی تو مارا جائے گا۔

میرے والد صاحب اور والدہ کو پتہ چلا تو انہوں نے مجھے بُرا بھلا کہا کہ میں نے ایک چور اُچکے کو گھر میں رکھ کر گھوڑی گنوا دی ہے۔ گاؤں والوں کو پتہ چلا تو انہوں نے طرح طرح کی باتیں کہیں۔ عالم کو تو سبھی چور کہتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ اللہ کا شکر ادا کرو کہ زیور اور نقدی نہیں لے گیا لیکن عالم کو چور کہنے کو میرا دل نہیں مانتا تھا۔ البتہ میں یہ سوچ کر شک میں پڑ جاتا تھا کہ عالم نے گھوڑی کتنی استادی سے باہر نکالی ہے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ یہ ضرور تھا کہ مویشی اسی کی تحویل میں تھے لیکن دو اور نوکر بھی موجود تھے۔ ہم سب اندر سوئے ہوئے تھے۔ گھوڑی کی زین وہ نہیں لے گیا تھا۔ وہ اندر تھی۔ گھوڑی پر رات کو ہم کمبل ڈال دیا کرتے تھے اور ایک تنگ مویشیوں کے کمرے میں لٹکا رہتا تھا۔ وہ غائب تھا۔

عالم نے یہی کیا ہو گا کہ گھوڑی کا کمبل تہ کر کے پیٹھ پر ڈال لیا ہو گا اور تنگ کس لیا ہو گا۔ لگام کی جگہ رسّہ تھا لیکن ہماری گھوڑی کو لگام کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑی شریف گھوڑی تھی۔ اس سے مجھے شک ہوتا تھا کہ عالم

استاد ہے اور وہ شریف لڑکا نہیں۔ یہ سوچ کر پھر خیال آ جاتا کہ نہیں، عالم چور نہیں۔ وہ ہماری مردانگی پر لعنت بھیج کر بہن کو لینے چلا گیا ہے۔

گاؤں کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ گھوڑے نکالو اور اسے تلاش کرو۔ ہر طرف نکل جاؤ۔ گھوڑی زین اور لگام کے بغیر گئی ہے، لے جانے والا بچّہ ہے، دُور نہیں گیا ہو گا۔

اللہ نے میرے دو دوستوں کو عقل دی۔ انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ ہم سب شکاری دوست کتے ساتھ لے جاتے ہیں۔ گھوڑی کا کھُرا (پاؤں کے نشان) دیکھتے ہیں اور اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ مجھے یہ مشورہ پسند آ گیا۔ میرے چار کتے تھے۔ اپنی گھوڑی کی بُو سے واقف تھے۔ ہمارے بزرگوں کو بھی یہ تجویز پسند آ گئی۔ ہم نے کتے کھولے اور گاؤں سے نکل گئے۔

دوستوں نے پوچھا کہ کدھر چلیں؟ میں نے انہیں کہا کہ عالم کے گاؤں کا رُخ کرو۔ وہ اور کہیں نہیں جا سکتا۔ ہم اُدھر کو چل پڑے۔ کھیتوں میں فصل کھڑے تھے۔ مینڈھ پکے تھے، اس لیے گھوڑی کا کھُرا نہ مل سکا۔ تھوڑا آگے گئے تو کھُرا نظر آ گیا۔ گھوڑی کے نعل دس بارہ روز پہلے لگے تھے۔ کوئی شک نہیں تھا۔ میرا ایک کتا بُوگیر تھا۔ بہت سیانا کتا تھا۔ اس کا مُنہ پکڑ کر میں نے گھوڑی کے پاؤں کے ایک نشان پر جھکایا۔ کتے نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارہ کیا تو وہ ناک زمین کے ساتھ لگا کر آگے ہی آگے دوڑتا گیا۔ دوسرے بُوگیر کتے بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ آگے کنکروں والی زمین آ گئی، پھر ایک نالہ آیا۔ کنکروں پر نشان مدہم تھے اور کبھی شک ہوتا تھا کہ نشان نہیں ہیں۔ بُوگیر کتوں نے بہت مدد کی اور وہ ہمیں نالے میں سے گزار کر لے گئے۔

بہت آگے گئے تو کتوں کو ایک گیدڑ نظر آ گیا۔ تمام کے تمام کتے گیدڑ کے پیچھے دوڑ پڑے۔ بُوگیر کتے بھی ساتھ ہی گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتے کھڈوں میں گم ہو گئے۔ گیدڑ کو مارے اور کھائے بغیر انہیں واپس نہیں آنا

تھا۔ انہیں یہ تو پرواہی نہیں تھی کہ ہم انہیں کس لیے باہر لائے ہیں۔ ہم
ان کے پیچھے نہیں گئے۔ آہستہ آہستہ چلتے گئے۔ گیدڑ بہت تیز ہوتا ہے۔
کتوں کو میل بھر دور لے گیا۔ ہم مزے مزے سے چلتے گھوڑی کا کھرا دیکھتے
گئے اور ایک جگہ رُک کر کتوں کا انتظار کرتے رہے۔

اس میں بہت وقت گزرتا گیا۔ عالم کا گاؤں دوسری تحصیل میں تھا۔
میں یہ سوچنے لگا کہ اگر کھرا ہمیں عالم کے گاؤں میں لے گیا تو وہاں کیا کریں
گے؟ اگر یہ کہا کہ یہ لڑکا گھوڑی چُرا لایا ہے تو وہ کہیں گے کہ یہاں سے
پیسے چُرا کر لے گیا تھا، پھر تو اسے سیدھا تھانے لے جائیں گے۔ پھر
میں یہ بھی سوچتا کہ وہ کسی اور گاؤں کا چور ہو گا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ
اسی مسئلے پر باتیں ہوتی رہیں مگر ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

ہم بہت سفر طے کر چکے تھے۔ کتوں نے بہت سا وقت ضائع کر دیا۔

دن کا دوسرا پہر ختم ہو گیا اور سورج سر سے آگے نکل گیا۔ کتے واپس آ گئے۔
ہم نے انہیں زنجیریں ڈال لیں۔ صرف دو کھوجی کتوں کو کھلا رکھا۔ گھوڑی
کا کھرا صاف تھا مگر دوسری طرف مڑ گیا تھا۔ کھوجی کتوں کو ایک بار پھر
گھوڑی کے کھرے دکھائے اور وہ زمین کو سونگھتے آگے چلے گئے۔ آگے
سلوں والی چٹانیں اور پتھروں والی بڑی پختہ زمین آ گئی۔ یہاں ہمیں شک ہوا
کہ عالم نہیں گیا ہو گا۔ وہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ ادھر اسی طرح کی چٹانیں،
ٹیلے اور کھڈ تھے۔ ویران جگہ تھی لیکن کتے اُدھر ہی جا رہے تھے۔

ہمیں ایک بڑا صاف نشان مل گیا۔ یہ گھوڑی کی لید تھی۔ لید تازہ تھی
کوئی شک نہ رہا کہ گھوڑی یا کسی اور کا گھوڑا ادھر گیا ہو گا ہم چلتے گئے اور آگے
ایسا علاقہ آ گیا جو گہرائی میں جاتا تھا۔ اردگرد چٹانیں اور ایک طرف مٹی
کی دیوار کھڑی تھی۔ کتے گھوم کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور
بھونکنے لگے۔ ہم دوڑ کر پہنچے۔ آگے ہماری گھوڑی کھڑی تھی۔ عالم کلہاڑی
تان کر کھڑا تھا اور کتے اس پر بھونک رہے تھے۔ ہم نے کتوں کو بلایا تو

وہ خاموش ہو گئے۔ عالم کلہاڑی تانے کھڑا رہا۔

میں نے اسے کہا ـــــ "عالمے! ادھر آؤ۔"

اس نے کلہاڑی دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا
ـــــ "میں یہیں کھڑا رہوں گا، تم وہیں کھڑے رہو۔ میں تمہاری گھوڑی
کا چور ہوں۔ پہلے میری بات سُن لو۔ اگر تم لوگوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش
کی تو میں تو مارا ہی جاؤں گا لیکن دو تین کو ساتھ لے کے مروں گا۔"

میں نے اُسے کہا کہ تم بات کرو۔ ہم تم پر کوئی زبردستی نہیں کریں گے۔

اُس وقت میں نے عالم میں یہ تبدیلی دیکھی کہ وہ جب ہمارے پاس تھا تو
بات کرتا تھا اور رو پڑتا تھا۔ منت سماجت کے لہجے میں بات کرتا تھا،
مگر اب اُس کا لہجہ بڑا سخت تھا۔ وہ تیرہ سال کا بچہ لگتا ہی نہیں تھا۔ آواز
بڑی سخت اور فیصلے والی تھی۔ وہ پورا مرد بن گیا تھا۔ ہم اُس سے ذرا دُور
کھڑے رہے۔ اُس نے گھوڑی کی رسّی اپنے بازو کے ساتھ لپیٹی ہوئی تھی
اور کلہاڑی آگے کر رکھی تھی۔

اُس نے جب باتیں شروع کیں تو ہماری مردانگی ہل گئی۔ اُس نے کوئی
لمبی چوڑی باتیں نہیں کیں۔ کوئی قسم نہیں کھائی۔ لہجے سے پتہ چلتا تھا کہ اُس
کا ہر ایک لفظ اس کے دل کے اندر سے نکل رہا ہے۔

"تم اتنے سارے آدمی بیس کتے ساتھ لیے ایک بچے کو گھیر کر کھڑے
ہو اور سمجھتے ہو کہ تم جوان ہو۔" اُس نے کہا۔ "تم سب بے غیرت ہو۔ تم
ہیجڑے ہو، تم زمینوں اور چوباروں پر بادشاہ بنے ہوئے ہو۔ تم میں
غیرت ہوتی تو ایک غریب بچے اور اُس کی بہن کی مدد کرتے مگر تمہاری ذاتیں
اونچی ہیں۔ تم نیچ ذات کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر لٹا سکتے ہو۔ اسے پلید
کر سکتے ہو۔ اپنے گناہ اس کے منہ پر مل سکتے ہو۔ اس کی کوئی مدد
نہیں کر سکتے۔"

مجھے وہ وقت آج بھی نہیں بھولا جب تیرہ سال کی عمر کا کمزور سا بچہ

اتنے سارے جوانوں کو شرمسار کر رہا تھا۔ خدا کی قسم ہماری رگوں میں خون جم گیا۔ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس کے منہ کی طرف دیکھیں۔

"میں نے تمہاری گھوڑی چوری کی ہے"۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اپنا کام کرکے گھوڑی واپس کر دُوں گا۔ اگر گھوڑی کسی نے چھین لی تو پیسے دُوں گا۔ ڈاکہ ڈالوں گا، چوری کروں گا اور گھوڑی کی دُگنی قیمت تمہارے قدموں میں رکھ دوں گا۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ——— "بیوقوف کے بچّے گھوڑی سے کروگے کیا؟ میں تم سے گھوڑی واپس نہیں مانگوں گا۔"

"میں اپنی بہن کو لینے جا رہا ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔ "میں چور نہیں ہوں اس لیے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اچھی طرح سُن لو۔ مَیں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں دن کے وقت گاؤں میں نہیں جا سکتا ورنہ پکڑا جاؤں گا اور اگر گھوڑی لے کر گیا تو وہ گھوڑی چھین لیں گے۔ میں شام تک یہاں چھُپا رہوں گا۔ اندھیرے میں اپنے گاؤں جاؤں گا۔ گھوڑی باہر رکھوں گا۔ اندر جا کر بہن کو لاؤں گا اور گھوڑی پر بٹھا کر تمہارے گاؤں لے آؤں گا۔ میرا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ اگر تم میں شرم اور غیرت ہوئی تو میری بہن کے سر پہ ہاتھ رکھ لوگے۔ اگر تم نے کہا کہ اس گاؤں میں تمہاری کوئی جگہ نہیں تو اس کلہاڑی سے اپنی بہن کا سر کھول دوں گا۔ اسے اپنے ہاتھوں قبر میں اتار دوں گا اور پھانسی چڑھنے کے لیے تھانے چلا جاؤنگا۔ تم اور کچھ نہ کرو۔ مجھے گھوڑی لے جانے دو۔ مجھے چور نہ سمجھو۔"

تم حیران ہوتے ہوگے کہ تیرہ سال کی عمر کے بچّے نے ایسی پکّی باتیں کی ہوں گی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ وہ زمانہ کیسا تھا۔ وہ مردانگی کا زمانہ تھا۔ آج فیشن اور بدنیتی کا زمانہ ہے۔ اُس زمانے میں ہم دس سال کی عمر میں جوان ہو جایا کرتے تھے، پھر یہ بھی سوچو کہ عالم پر ظلم ہوًا تھا۔ اس کی مدد

کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بھڑک اُٹھا تھا۔ حالات نے اسے جوان مرد بنا دیا تھا۔ اور جب اس نے ہمیں بے غیرت کہا تو ہماری غیرت جاگ اُٹھی۔

میرے دوستوں نے مجھے کہا کہ گھوڑی قربان کر دو، ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے، اس کی یہ مدد کریں کہ گھوڑی لے جائے۔ آگے اس کی قسمت۔

میں خود یہی چاہتا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جس کے آگے برچھی کی طرح لوہے کی نوک تھی۔ میں نے یہ برچھی پھینک دی اور عالم کے قریب گیا۔ اسے آہستہ سے کہا ——— "جا عالمے! ہم تمہیں رات کو راستے میں ملیں گے"۔

اُس کے آنسو نکل آئے۔ میرے دوست بھی آگے آ گئے۔ ہم نے ایک سکیم بنالی۔ عالم بہت خوش ہوًا۔ ہمارے پاس روٹی تھی۔ عالم کو کھلائی، خود بھی کھائی اور واپس آ گئے۔

اپنے گاؤں پہنچے تو سُورج غروب ہونے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی۔ ہم نے سب کو بتایا کہ گھوڑی نہیں ملی اور ہم نے سب کو یہ بھی بتا دیا کہ گھوڑی واپس آ جائے گی۔ عالم بھی واپس آ جائے گا۔ بہت سے لوگوں کو عالم کا قِصّہ معلوم نہیں تھا۔ میں نے سب کو یہ قِصّہ سُنا دیا اور کہا کہ وہ شاید ہمارے بھروسے پر اپنی بہن کو لینے گیا ہے۔ اب یہ ہوگا کہ وہ بہن کو لے کے آ جائے گا یا گھوڑی سمیت ہمیشہ کے لیے گیا۔

کسی نے کچھ کہا۔ ہر کوئی اپنی عقل اور نیّت کے مطابق بات کرتا تھا۔ ہم ہر بات شاید کے لہجے میں کرتے تھے تاکہ یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم عالم اور گھوڑی کو دیکھ آئے ہیں اور ہم کچھ اور بھی کرنے والے ہیں۔ گاؤں والوں کو ہم نے بہت حد تک تیار کر لیا کہ عالم اپنی بہن کو لے آئے تو اسے

پناہ دے دیں گے۔

میں اُس رات کو آج تک نہیں بھولا اور جب تک زندہ ہوں نہیں بھول سکوں گا۔ میں اور میرا ایک دوست خداداد، اللہ اُسے جنّت نصیب کرے، میرے ساتھ تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ پگڑیاں سروں اور چہروں پر لپیٹ رکھی تھیں۔ ہمیں بالکل یقین نہیں تھا کہ یہ رات ہماری زندگی کی آخری رات ہے یا ہم زندہ واپس آ جائیں گے۔ ہم گاؤں سے بہت دُور چلے گئے تھے۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ لوگ جلدی سو جایا کرتے تھے۔

سب سو گئے تو میں چوروں کی طرح گھر سے نکلا۔ اُدھر سے خداداد آ گیا۔ ہم نے عالم کو بتا دیا تھا کہ وہ آدھی رات تک اپنے گاؤں سے ذرا دور انتظار کرے۔ ہم پہنچ جائیں گے لیکن گاؤں کے اندر نہیں جائیں گے۔ ہم نے اسے راستہ بھی بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر ہمیں دیر ہو جائے اور وہ اپنا کام کر گزرے تو فلاں راستے سے آئے۔ ہم اُسے مل جائیں گے۔

ہم بہت تیز چلتے گئے تھے۔ رات اندھیری تھی۔ یہ میری زندگی کا بڑا ہی سخت امتحان تھا۔ ہم نے عالم کا گاؤں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے راستہ اور نشانیاں بتا دی تھیں۔ فاصلہ پندرہ میل سے ذرا زیادہ ہی ہوگا۔

ہم اُس کے گاؤں کے قریب پہنچنے والے تھے۔ یہ ذرا کھلا اور میدانی علاقہ تھا۔ اندھیرے میں کوئی گاؤں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہمیں گھوڑے کے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گھوڑا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہم ایک اونچے کھیت کی مینڈھ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ گھوڑا آ رہا تھا، پھر وہ ہمیں ذرا ذرا سا نظر آنے لگا اور جب ہمارے قریب سے گزرا تو اس پر ایک لڑکا اور پیچھے اس سے بڑے قد کی عورت سوار تھی۔ گھوڑا نہ چل رہا تھا نہ دوڑ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے آواز دی —— "عالما" —— گھوڑا رک گیا۔ میں اور خداداد اُس تک گئے۔ وہ عالم تھا۔ اس کے پیچھے اس کی بہن تھی، اور گھوڑی وہی تھی۔ عالم گھوڑی سے اُترنے لگا تو میں نے اُسے کہا کہ وہ نہ اُترے۔ ہم پیدل چلیں گے لیکن وہ اُتر آیا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟" —— میں نے پوچھا۔

"ایک آدمی کو اُلٹا کر آیا ہوں۔ معلوم نہیں کون تھا۔" اُس نے کہا۔ "جلدی نکلو یہاں سے۔"

میرے کہنے کے باوجود عالم گھوڑی پر سوار نہ ہوا۔ اُس نے رسّی پکڑ لی اور چل پڑا۔ میں اور خداداد پیچھے رہے اور بار بار پیچھے دیکھتے رہے۔ کبھی رُک کر کان پیچھے کی آوازوں پر لگا لیتے لیکن پیچھے کوئی للکار اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے عالم کو اُٹھا کر گھوڑی پر اس کی بہن کے آگے بٹھا دیا۔ رسّی اپنے ہاتھ میں لے لی اور خداداد سے کہا کہ تھوڑی دُور تک دوڑیں تو اچھا رہے گا۔

ہم دوڑ پڑے۔ عالم سے کہا کہ ذرا مضبوطی سے بیٹھے رہنا۔ زین تو تھی نہیں۔ گھوڑی کی پیٹھ پر کمبل تھا اور رکابیں بھی نہیں تھیں۔ ہم نے بہت سارا فاصلہ دوڑتے طے کر لیا۔ اترائیاں اور چڑھائیاں زیادہ تھیں۔ تین برساتی نالے پار کیے۔ پیچھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ راستے میں مَیں نے عالم کو سمجھا دیا کہ وہ کسی کو یہ نہ بتائے کہ میں اور خداداد یہاں تک آئے تھے۔

ہمارے دل صاف تھے۔ ایک لڑکی کی عزت بچانے گئے تھے، اس لیے خدا نے عزت رکھ لی۔ گاؤں میں ابھی کوئی نہیں جاگا تھا جب ہم گھر تک پہنچے۔ خداداد اپنے گھر چلا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ جس طرح چوری چھپے گھر سے نکلا تھا اسی طرح داخل بھی ہو گیا۔ وہ ڈیوڑھی میں اکیلا سویا کرتا تھا۔

میں نے عالم کو باہر ٹھہرایا اور سمجھا دیا کہ وہ کیا کرے۔ میں چوروں کی

طرح اندر آ گیا۔ کلہاڑی رکھی۔ پگڑی اتار دی اور بستر میں لیٹ گیا۔ تھوڑی
دیر میرے بتانے کے مطابق عالم نے باہر سے دروازہ کھٹکٹایا۔ میں
نہیں اُٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے والد صاحب اُٹھیں گے۔ اسی طرح
ہُوا۔ والد صاحب نے دروازہ کھولا۔ مَیں بھی اُٹھا اور آنکھیں ملتا ہُوا
باہر چلا گیا۔ پوچھا کون ہے؟

عالم گھوڑی سے اُتر آیا تھا۔ اُس نے میرے والد صاحب کے
پاؤں پکڑ لیے اور کہا ــــ "مجھے چور کہہ لیں، سزا دے لیں، یہ ہے میری
بہن اور یہ ہے آپ کی گھوڑی۔ بہن کی عزت کی خاطر گھوڑی چوری کی تھی۔
اللہ کے سوا ہمارا اور کوئی نہیں۔"

والد صاحب نے اسے کہا ــــ "بہن کو اتار کر اندر لے جاؤ اور
گھوڑی وہیں باندھ دو" ــــ عالم اور اس کی بہن اندر چلے گئے تو والد صاحب
نے مجھے کہا ــــ "تم ٹھیک کہتے تھے۔ یہ مجھے بھی مظلوم ہی نظر آتے ہیں۔"

صُبح کے وقت مَیں نے عالم کی بہن کو دیکھا۔ خدا نے اُسے بہت
حُسن دیا تھا۔ بعض غریبوں اور بے کسوں پر خدا یہ ظلم کرتا ہے کہ انہیں
حُسن دے دیتا ہے۔ یہی بدبختی اس لڑکی کی تھی۔ کیا قد بُت اور کیا شکل
وصورت، توبہ توڑتی تھی۔ میری ماں کو اللہ کروٹ کروٹ جنت کا سکون
دے، اس نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

عالم نے سنایا کہ وہ آدھی رات سے بہت پہلے اپنے گاؤں کے
قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے ہمارا انتظار کیا لیکن بچہ تھا۔ جلدی بے چین
ہو گیا۔ اس نے گھوڑی گاؤں کے قریب ایک درخت سے باندھ دی
اور کلہاڑی لے کر اپنے مکان کے پہلو کی دیوار سے اندر گیا۔ گاؤں میں
سب سو رہے تھے۔ وہاں رکھوالی والا کتا بھی نہیں تھا۔ اس کے مکان
کا جو ایک ہی کمرہ تھا اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دستک دی۔
دو تین بار دستک دینے پر اسے اندر سے اپنی بہن کی سخت ڈری

ہوئی آواز سنائی دی ــــ "اس وقت دروازہ نہیں کھولوں گی۔
اللہ کے واسطے تم جو کوئی ہو چلے جاؤ۔ میں پہلے ہی بہت بدنام ہوں۔"

عالم نے اسے کہا ــــ "جیجو، میں عالما ہوں۔ جلدی اُٹھو۔"

دروازہ کھلا۔ عالم کو معلوم تھا کہ گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ساتھ لے
جانے کے قابل ہو۔ وہ صحن کے دروازے سے باہر نکلے اور گاؤں سے
نکل گئے۔ اُس وقت پیچھے سے کسی کی آواز آئی ــــ "ٹھہرو ادئے کون ہو؟"

عالم نے اچھا کیا کہ بھاگا نہیں ورنہ وہ پکڑے جاتے۔ وہ رُک گیا۔
بہن کو اس نے کہا کہ وہ آگے نکل جائے۔ اُس آدمی نے قریب آکر پوچھا
"ادئے کون ہے تُو"؟ ــــ اُس آدمی کے پاس لاٹھی تھی۔ اُس نے جیجو
کو دُور جاتے دیکھا تو اسے کہا ــــ "ادئے ٹھہر جا تُو بھی"۔

عالم کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ اس نے بڑی ہی تیزی سے کلہاڑی
کا بھرپور وار اس آدمی کے سر پر کیا۔ وہ کہتا ہے کہ کلہاڑی نے اس کا
ماتھا اور سر چیر دیا تھا۔ وہ آدمی ایک ہی وار سے گر پڑا۔ اس کی آواز بھی
نہ نکلی۔ عالم بہن کی طرف دوڑا۔ دونوں گھوڑی تک پہنچے اور کُود کر سوار
ہو گئے۔ آگے ہم مل گئے۔

میرے گاؤں کے بزرگوں اور بڑی عورتوں نے عالم اور جیجو کو قبول
کر لیا۔ خطرہ تھا کہ عالم ایک آدمی کو قتل کر آیا ہے۔ پولیس نہ آجائے
لیکن بہت دن گزر گئے پولیس نہ آئی۔ اگر پولیس آ بھی جاتی تو گاؤں کے
لوگ عالم کو بچانے کے لیے تیار تھے، مگر اللہ نے کرم کیا۔ گاؤں میں کسی
کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ میں اور خداداد عالم کی مدد کے لیے گئے تھے۔ بہرحال
بہن بھائی میرے گھر رہنے لگے لیکن یہ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔

عالم نے ہمارے مویشی سنبھال لیے اور جیجو گھر کا کام کرنے لگی۔ یہ لڑکی
چُپ چُپ رہتی تھی۔ کبھی کبھی روتی بھی تھی۔ کہتی تھی کہ ماں باپ بہت یاد
آتے ہیں۔ اللہ میری ماں کو بہشت عطا فرمائے۔ جیجو کی اتنی دلجوئی کرتی تھی

کہ تھوڑے عرصے میں وہ اپنی ماں کو بھول گئی اور جیجو نے گھر کا کام اس طرح سنبھالا کہ میری ماں گھر کا کام کاج بھول گئی۔

وہ ذات پات کا زمانہ تھا۔ اونچی ذاتوں والے اپنے آپ کو بادشاہ اور چھوٹی ذاتوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے تھے۔ ذات میری اونچی تھی اور عالم نیچ ذات کا تھا لیکن اُس کا اخلاق اُونچا تھا۔ ہمیں یہ ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ اسے یا اس کی بہن کو کبھی یہ کہنا پڑے کہ فلاں کام رہ گیا ہے یا فلاں کام وقت پر نہیں ہوا۔ پیسے بھی ان کے ہاتھ میں آنے جانے لگے۔ انہوں نے کبھی ایک پیسے کی بھی خیانت نہ کی۔

تین مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک روز عالم دوڑتا ہوا میرے والد صاحب کے پاس آیا۔ وہ گاؤں سے تھوڑی دور شاید مویشیوں کو لے گیا تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اس کے گاؤں کے دو آدمی جا رہے تھے۔ عالم اُن کے راستے میں تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ گاؤں کی طرف دوڑ پڑا اور وہ دونوں آدمی اس کے پیچھے آ گئے۔

والد صاحب باہر نکلے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ آدمی گاؤں میں آ گئے اور والد صاحب سے ملے۔ انہیں بٹھایا۔ والد صاحب نے مجھے بھیج کر گاؤں کے تین چار بزرگوں کو بُلا لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ آدمی کیا بات کریں گے۔ بزرگ آ گئے تو ان آدمیوں نے کہا کہ ہم اس لڑکے کو ساتھ لے جائیں گے۔ یہ ہمارے گاؤں کا کمین ہے۔ وہاں سے چوری کر کے بھاگ آیا ہے۔ اس کی بہن کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور اُس رات ہمارا ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔ یہ قتل اُسی شخص نے کیا ہے جس کے ساتھ اس کی بہن گئی ہے۔ پولیس کو ابھی تک اُس کا کھرا کھوج نہیں ملا۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے آدمی کی لاش باہر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کا سر کلہاڑی سے کھلا ہوا تھا۔

میرے والد صاحب نے یہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی روز لڑکی

ان لوگوں کو ہمارے گاؤں میں نظر آ جائے اور پولیس اسے برآمد کر لے۔ اس طرح معاملہ زیادہ بگڑے گا۔ بہتر یہ ہے کہ بات ابھی ختم کر دی جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے ان آدمیوں سے کہا کہ اس لڑکے کی بہن نہیں ہے۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھی۔ رہا تمہارے آدمی کے قتل کا قصہ تو ذرا عقل سے کام لو۔ کیا یہ چھوٹا سا لڑکا اتنے بڑے آدمی کا سر کلہاڑی سے کھول سکتا ہے؟

والد صاحب کو معلوم تھا کہ اُس آدمی کو عالم نے ہی قتل کیا ہے۔ عالم خاموش کھڑا سُن رہا تھا اور وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اگر وہ قتل کے الزام میں پکڑا جاتا تو سیدھا پھانسی کے تختے پر جاتا۔ میرے والد صاحب اُسے صاف بچا رہے تھے۔ اُن آدمیوں نے کہا کہ لڑکی کو بلاؤ۔ قتل کے متعلق اسے ضرور معلوم ہوگا۔ والد صاحب نے لڑکی کو سامنے لانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ لڑکی سامنے آئی تو وہ تم لوگوں کی ساری کرتوت بیان کرے گی۔ ایک یتیم اور بے آسرا لڑکی کو تم نے اپنی بیٹی نہیں سمجھا۔ والد صاحب نے انہیں بتایا کہ ان کے گاؤں کا ہاشم نام کا ایک آدمی لڑکی کے ساتھ کتنا شرمناک سلوک کرتا رہا ہے ورنہ یہ بہن بھائی وہاں سے نہ بھاگتے۔

ان آدمیوں نے دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ ہمارے بزرگوں نے کہا کہ تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ ہم اونچی بات نہیں کریں گے۔ بس یہ کہیں گے کہ اپنے آدمی کے خون کا بدلہ لینا ہے تو مردوں کی طرح للکار کر آؤ اور اگر اتنی ہمت نہیں ہے تو پولیس کو لے آؤ، پھر ہم دیکھ لیں گے کہ پولیس یا تم اس لڑکی اور لڑکے کو کس طرح لے جاتے ہو۔

اس طرح تھوڑی دیر گرما گرمی ہوتی رہی پھر معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہم نے اُن دونوں کی خوب خاطر تواضع کی۔ انہوں نے بتایا کہ جو آدمی مارا گیا ہے وہ اُن کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ وہ ذات کا کمہار تھا۔ معلوم نہیں اسے

کون قتل کر گیا ہے۔ چونکہ وہ کمہار تھا اس لیے اُن لوگوں نے اس کے قتل میں کوئی دلچسپی نہ لی اور دلچسپی نہ لینے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمارے بزرگوں نے ان کے کان کھول کر انہیں سمجھا دیا تھا کہ یہاں اُن کی کوئی دھمکی یا کوئی کارروائی نہیں چلے گی۔ عالم اور جیجو اُن کے لگتے بھی تو کچھ نہیں تھے کہ وہ اُن کی واپسی پر زور دیتے۔

وہ آدمی چلے گئے۔ ہم چوکنے رہے کہ وہ لوگ کوئی گڑبڑ کریں گے لیکن وہ چپ رہے اور بات ختم ہو گئی۔

عالم مویشیوں کے ساتھ اور کھیتی باڑی میں لگا رہتا تھا۔ اس نے گاؤں کے ہر گھر میں اپنی حیثیت ایسی بنالی تھی کہ اُونچی ذات کے بچوں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر دیا کرتا تھا۔ اس حیثیت کے باوجود وہ خوش نہیں رہتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا بہت پیار تھا۔ میرے پاس جب بیٹھتا یہی ایک بات لے کے بیٹھتا کہ اپنی بہن کو ایک مکان بنا دونگا اور اسے عزت سے کسی اچھے گھر میں بساؤں گا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ میری قسم ہے جو پوری نہ ہوئی تو میں خدا کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔

یہ تو اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی بہن کی شادی اس کی ذات کے کسی غریب آدمی سے ہوگی۔ اس نے کبھی ایسی خواہش ظاہر تو نہیں کی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہن کو کمین ذات کے کسی گھر میں دینے پر خوش نہیں۔ بیٹا، اگر تم جیجو کو اس جوانی میں دیکھتے تو یہ ضرور کہتے کہ یہ لڑکی کمین ذات کی یا غریب باپ کی بیٹی نہیں۔ وہ بڑے صاف ستھرے رنگ کی خوب صورت لڑکی تھی جس کی قسمت میں دوسروں کی خدمت اور غلامی لکھی تھی اور اس کی قسمت میں ایسا خاوند لکھا تھا جو ایک گز زمین کا مالک بھی نہیں ہو سکتا تھا اور اسے ساری عمر اُونچی ذات کا محتاج رہنا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں کمین ذاتیں غیر کاشت کار کہلاتی تھیں اور ان ذاتوں کے لوگ زمین کے مالک نہیں ہو سکتے تھے۔ عالم ہماری نوکری کر رہا

تھا۔ روٹی کپڑے کے علاوہ ہم اسے کبھی کبھار پیسے بھی دیا کرتے تھے۔ وہ پیسے اپنی بہن کو دے دیتا تھا۔

ایک روز اس کی ذات کے ایک آدمی نے میرے والد صاحب سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو جیجو کا رشتہ اس کے بیٹے کو دے دیں۔ والد صاحب نے عالم سے بات کی۔ مَیں بھی سُن رہا تھا۔ عالم کی عمر چودہ سال ہو چکی تھی۔ والد صاحب اسے بچہ سمجھ کر بلکہ کمین ذات کا بچہ سمجھ کر اس سے اجازت نہیں لے رہے تھے بلکہ اپنا فیصلہ سُنا رہے تھے کہ اپنی بہن کا رشتہ اُس گھر میں دے دو۔

عالم اُس گھر کو جانتا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بولا۔ باہر چلا گیا۔ میں باہر گیا تو وہ باہر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے سر جھکا کر بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب گیا، اسے بلایا تو اُس نے سر اُٹھایا اور فوراً دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر پھیرے۔ وہ رو رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو اس نے کہا کہ میری کوئی ذات نہیں۔ ذرا دیکھو کہ میری بہن کس گھر میں جا رہی ہے۔

یہ تو اس کی رائے تھی اور سچ پوچھو بیٹا، میرا اپنا دل نہیں مانتا تھا کہ جیجو جیسی لڑکی ایسے غریب گھر میں جائے۔ میں نے اُسی روز والد صاحب سے کہا کہ وہ عالم کو مجبور نہ کریں، اسے یہ گھر پسند نہیں۔ والد صاحب میری بات مان لیا کرتے تھے۔ یہ بات بھی انہوں نے مان لی۔

رات کے وقت عالم میرے پاس بیٹھا تو مَیں نے اسے خوشخبری سنائی کہ اس پر زبردستی نہیں کی جائے گی لیکن وہ پھر بھی خوش نہ ہوا۔ بہت دیر کچھ سوچتا رہا پھر جھجک جھجک کر کہنے لگا ——— "راجہ جی میں شہر نہ چلا جاؤں؟ وہاں نوکری کروں گا۔ پیسے ملیں گے اور وہاں مجھے کوئی کمین نہیں سمجھے گا پھر مَیں جیجو کو ایسے گھر بیاہ دوں گا جو کمین نہیں ہوگا۔"

میں اسے سمجھانے لگا کہ میرے گھر میں اور سارے گاؤں میں سب اس کی عزت کرتے ہیں لیکن وہ میری بات نہیں سمجھ رہا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ شہر

میں نوکری کرنا چاہتا ہے۔

"عالمے! تم ان پڑھ ہو۔ میں بھی ان پڑھ ہوں"۔ میں نے اسے کہا۔ "تم لوگ فوج کے سوا اور کہیں بھی نوکری نہیں کر سکتے اور تم تو فوج کی نوکری بھی نہیں کر سکتے کیونکہ تمہاری ذات کے لوگوں کو فوج میں نہیں لیتے۔ تم گاؤں میں رہو۔ دیکھو اللہ کیا کرتا ہے"۔

وہ غصے میں آگیا۔ کہنے لگا ——— "یہاں مجھے کون یقین دلا سکتا ہے کہ میری بہن کی عزت محفوظ رہے گی؟ راجوں راجپوتوں کی نیت خراب ہوتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ وہ آج تمہارے گھر میں ہے تو مجھے تسلی ہے کل بیاہ دوں گا تو معلوم نہیں خاوند اسے کس گھر کی لونڈی بنا دے۔ مجھے کوئی راستہ دکھاؤ راجہ جی! میں بہن کو عزت دار گھر میں بساؤں گا یا اسے قتل کر کے اپنے ہاتھوں دفن کر دوں گا اور پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ مجھے تمہارے احسان نے باندھ لیا ہے۔ کہو گے تو ساری عمر تمہارے قدموں میں گزار دوں گا لیکن تم میری قسم پوری نہیں کر سکتے۔ بس یہی غم کھا رہا ہے"۔

میں نے اسے سمجھا بجھا لیا۔ وہ سچی بات کہہ رہا تھا۔ اس کے خدشے بھی سچے تھے لیکن وہ آخر بچہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ جوان بہن کو شہر لے جائے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ جیجو سارے گاؤں کی عزت ہے۔ عالم سمجھ گیا لیکن پوری طرح نہیں سمجھا۔ تھوڑے دن گزرتے تو وہ پھر بھی قصہ لے بیٹھتا اور میں اسے ٹھنڈا کر لیتا۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ سترہ سال کی عمر میں عالم ستائیس سال کا جوان لگتا تھا اور جیجو کی جوانی نے گاؤں بھر کو چونکا دیا۔ اب وہ چپ چپ رہنے کی بجائے کھل کر باتیں کرتی اور لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی کرنے لگی تھی لیکن اس میں چھچھورا پن نہیں تھا۔ ناواقف لوگ اسے اونچی ذات کی لڑکی سمجھتے تھے۔ میری ماں نے اس کی بہت قدر کی تھی۔

ان دنوں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ہمارے گاؤں کے

بہت سے جوان فوج میں تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں نے بھرتی تیز کر دی۔ ایک اور سال گزر گیا تو انگریز نے بھرتی کے لیے ذات پات کی پابندی ہٹا دی۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عالم ایک روز بھرتی ہونے کے لیے شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر اور میرے والد صاحب کے پاؤں پکڑ کر اجازت مانگی۔ میرے ساتھ اس نے وہی باتیں کیں جو وہ ہزار مرتبہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ اس نے رو رو کر مجھے اور والد صاحب سے کہا کہ جیجو کا اللہ کے سوا اور تم لوگوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ میں اسی کی خاطر تم لوگوں کی مرضی کے خلاف جا رہا ہوں اور جان کی بازی لگا رہا ہوں۔ زندہ واپس آگیا تو اپنی بہن کے لیے کچھ لے کر آؤں گا۔ مارا گیا تو اسے بھی مار کر کہیں دبا دینا۔

جیجو نے اسے بہت روکا۔ وہ نہیں رکا۔ شہر چلا گیا اور اسی شام بھرتی کے کاغذ لے کر آگیا۔ دوسرے دن وہ ٹریننگ کے لیے روانہ ہو گیا۔ جاتے وقت اس نے جیجو سے کہا ——— "نہ رو جیجو۔ تمہیں عزت دوں گا یا موت"۔

وہ چلا گیا اور جیجو کئی دن روتی رہی۔ بہن بھائی ایک دوسرے کے لیے جی رہے تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ ماں نہ باپ۔ جیجو کے لیے بھائی جیتے جی مر گیا۔ ٹریننگ کے دوران عالم کسی سے خط لکھوا کر کبھی کبھی بھیج دیتا تھا۔

اسے گئے ہوئے شاید تین مہینے گزرے تھے کہ میرے والد صاحب فوت ہو گئے۔ گھر اور زمین کی ذمہ داریاں میرے اوپر آپڑیں۔ عالم ٹریننگ ختم کر کے چند دنوں کی چھٹی آیا۔ سامان میرے دروازے پہ پھینک کر مجھے ساتھ لیا اور قبرستان میں گیا۔ میں نے اسے والد صاحب کی قبر دکھائی۔ وہ قبر پر لیٹ گیا اور بچوں کی طرح بلک بلک

کر اور چیخ چیخ کر رویا۔ بہت دیر روتا رہا۔ اس کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے پھر مجھ سے بغلگیر ہوا۔ یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے۔ اس کا رونا مجھے آج بھی یاد ہے۔ شاید وہ اپنے والدین کی موت پر اتنا نہیں رویا ہوگا۔

اُس نے تنخواہ کی جو رقم بچائی تھی وہ بہن کو دے دی اور چھٹی پوری کر کے چلا گیا۔ اُسے پشاور کی ایک رجمنٹ میں بھیجا گیا تھا۔ جیجو ہمارے گھر کی بیٹی بن گئی تھی۔ اب اس کی شادی کا فیصلہ میری ماں کو اور مجھے کرنا تھا جو ہم عالم کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے میرے دو تین دوستوں اور گاؤں کے دو چار بوڑھوں نے کہا کہ لڑکی کو بیاہ دو۔ جوان ہو گئی ہے۔ آخر کمین ذات ہے۔ کوئی اور ہی گُل نہ کھلا دے۔

میں نے اُن لوگوں کو کچھ بھی نہیں کہا۔ مجھے سولہ آنے یقین تھا کہ جیجو کوئی اور گُل کھلانے والی لڑکی نہیں۔ اسے ہماری اور اپنے بھائی کی عزت کا پُورا پُورا خیال تھا۔

عالم کے خط آتے رہے جن میں وہ یہی ایک بات دہراتا تھا کہ جیجو کی عزّت کا خیال رکھنا۔

اُسے رجمنٹ میں گئے شاید چھ مہینے گزرے تھے کہ عالم کا ایک پوسٹ کارڈ ملا۔ میں نے ڈاکیے سے خط پڑھوایا۔ خط سُن کر مجھے چکّر آ گیا۔ زمین کانپنے لگی اور میں سوچنے لگا کہ جیجو اور ماں کو بتاؤں یا خاموش رہوں۔ عالم نے یہ پوسٹ کارڈ راولپنڈی کے جیل خانے سے لکھا تھا۔ اس نے خط میں صرف یہ لکھا تھا کہ مجھے کورٹ مارشل نے بارہ سال سزائے قید دے دی ہے۔ ملاقات کے لیے آؤ۔

میں اتنی سخت خبر اپنے سینے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اپنی ماں کو بتایا۔ اُس نے کہا کہ ابھی جیجو کو نہ بتاؤ اور عالم کو مل آؤ۔ راولپنڈی دُور نہیں۔ اپنا شہر ہے۔ میں دوسرے دن صبح سویرے گھر سے نکلا اور تین گھنٹے بعد راولپنڈی پہنچ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ عالم کا جُرم کیا ہے کہ اتنی لمبی سزا ملی

ہے۔ اس نے کسی کو قتل کر دیا ہوگا۔ لڑکا غیرت مند تھا اور ایک آدمی کو قتل بھی کر چکا تھا۔ اُس نے ضرور کسی کو قتل کر دیا ہوگا یا کسی انگریز افسر کی ٹانگ یا بازو توڑ دیا ہوگا۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے میں جیل خانے تک پہنچا اور ملاقات کے لیے درخواست دی۔ دو گھنٹے بعد عالم کو ملاقات کے لیے لایا گیا۔ ہم ہاتھ نہیں ملا سکے کیونکہ وہ سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا اور سلاخوں پر جالی بھی لگی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی بہن کے متعلق پوچھا اور میں نے اُس کے جرم کے متعلق پُوچھا۔

اُس نے بتایا کہ ٹریننگ کے بعد وہ پشاور اپنی پلٹن میں گیا۔ دو مہینے بعد اُس کی پلٹن قبائلی علاقے میں گئی۔ پندرہ روز پلٹن پہاڑوں میں گھومتی پھرتی رہی۔ قبائلیوں نے دو دفعہ اس کی پلٹن پر گولی چلائی۔ ادھر سے مشین گنوں کے مُنہ کھل گئے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اُس زمانے میں انگریز قبائلی علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور قبائلی پٹھان اُن کا مقابلہ کرتے تھے۔ اسے ہم لام کہا کرتے تھے۔ فرنٹیئر کا لام بہت مشہور تھا۔ ہمارے گاؤں کے تین آدمی فرنٹیئر کے قبائلی علاقے میں مارے گئے تھے۔

عالم کی پلٹن پندرہ دن پہاڑوں میں گھومتی رہی۔ گولی بھی چلی لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اِسے ٹریننگ سمجھتا رہا۔ چوتھے مہینے اس کی پلٹن کوہاٹ چلی گئی۔ دو مہینے وہاں رہی اور ایک دن اس کی پلٹن کو بنّوں کی طرف کُوچ کا حکم ملا۔ اُس زمانے میں پلٹنیں پیدل چلا کرتی تھیں۔ چار روز وہ پیدل چلتے رہے۔ پانچویں روز پلٹن کو پہاڑی علاقے کے اندر لے جایا گیا اور اس رات وادی میں پلٹن نے کیمپ کیا۔ رات کو اس نے اس علاقے میں بہت زیادہ فائرنگ کی آوازیں سُنیں۔ صبح کے

وقت پلٹن کو تیاری اور کوچ کا حکم ملا ۔ عالم نے بتایا کہ انگریز بہت زیادہ فوج لے کر گئے تھے ۔

اُس روز عالم کو ایک عجیب چیز دکھائی گئی ۔ یہ پٹھانوں کی لاشیں تھیں جنہیں رات کے وقت کسی جگہ گھیر کر مارا گیا تھا ۔ یہ لاشیں زمین پر رکھی ہوئی تھیں ۔ عالم کی کمپنی کو وہاں لے جایا گیا ۔ کمپنی کمانڈر انگریز تھا ۔ انگریز بہت اچھی اُردو بولا کرتے تھے ۔ اس نے عالم کی کمپنی کے جوانوں سے کہا ــــــ "دیکھو جوان لوگ ! یہ تمہارے دُشمن کی لاشیں ہیں"۔

ان میں چھ لاشیں مردوں کی تھیں ۔ دو عورتوں کی اور ان میں ایک بچّہ بھی تھا ۔ عالم نے دیکھا کہ مردوں میں دو کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں ۔ اچانک اس کے سینے میں آگ لگ گئی ۔ اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا ــــ "یہ تو پٹھان ہیں ۔ ہمارے مسلمان بھائی ہیں ۔ کیا ہم ان کے خلاف لڑ رہے ہیں ؟ او بے غیرتو، یہ عورتیں ہماری مائیں بہنیں ہیں"۔

ان کی کمپنی کو فوراً آگے چلنے کا حکم ملا ۔ عالم کا دماغ چکرا گیا ۔ اس نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑے گا ۔ دوست نے اسے بتایا کہ اُس نے لڑنے سے انکار کیا تو اُسے گولی مار دی جائے گی ۔ لڑائی میں حکم عدولی پر موت کی سزا ملتی ہے ۔ عالم بالکل نہ ڈرا ۔

اُسی دن کا ذکر ہے کہ پٹھانوں نے بریگیڈ کا راستہ روک لیا ۔ وہ تیار ہو کر آئے تھے ۔ عالم کی پلٹن پہاڑوں پر پھیل گئی ۔ پیچھے سے توپوں کی گولہ باری ہو رہی تھی ۔ پلٹنیں بھی بہت فائر کر رہی تھیں ۔ پٹھانوں کی گولیاں بھی آ رہی تھیں ۔

عالم ایک ٹیکری پر لیٹا ہوا نشانہ لیے بغیر فائر کر رہا تھا ۔ اسے اب پتہ چل چکا تھا کہ اس کا دُشمن کون ہے ۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پٹھانوں کی لاشیں آ گئیں جن میں دو عورتوں کی اور ایک بچّے کی بھی

لاش تھی ۔

وہ سیدھا سادا دیہاتی تھا ۔ اس نے عقل سے کام نہ لیا ۔ وہ جوش میں آکر اُٹھا اور آگے کو دوڑ پڑا ۔ ٹیکری سے اُترتے ہوئے اس نے پیچھے دیکھا اور "یا علی مدد" کا نعرہ لگا کر زور سے بولا ــــ "مسلمان کا بچّہ مسلمان پر گولی نہیں چلائے گا" ــــ اور وہ ٹیکری سے اُتر کر پٹھانوں کی طرف دوڑ پڑا ۔

اسے اس علاقے سے واقفیت نہیں تھی ۔ وہ آگے والی چٹان کے پیچھے چلا گیا ۔ آگے ٹیکریاں، چٹانیں اور پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان سے وہ گھومتا پھرتا دوڑتا گیا ۔ اسے کوئی پٹھان نظر نہ آیا ۔ توپوں، مشین گنوں اور رائفلوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ بہت دُور نکل گیا ہے لیکن ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں وہ دُور نہیں گیا تھا ۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ کدھر سے آیا ہے اور کدھر جانا ہے ۔ اچانک اس کے پاؤں کے قریب زمین پر دو تین گولیاں لگیں، پھر اس کے سر کے اُوپر سے گولیاں گزر گئیں پھر اس کے دائیں بائیں زمین پر گولیاں لگیں ۔ انہیں وہ پٹھانوں کی گولیاں سمجھتا رہا ۔ اس نے رُک کر "یا علی مدد" کا نعرہ لگایا اور بلند آواز سے کہا ــــ "میں تمہارا بھائی ہوں ۔ مجھ پر فائر مت کرو ۔ میں تمہارا ساتھی ہوں"۔

اسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ یہ کیسے ہوا ۔ ایک طرف سے، قریب ہی کہیں سے دس بارہ ہندو سپاہی جو اسی کی پلٹن کے تھے، نکلے اور اسے پکڑ لیا ۔ اس سے رائفل اور ایمونیشن لے لیا گیا اور اسے کیمپ میں بھیج دیا گیا ۔ جب ساری فورس واپس آئی تو اسے پلٹن کے ساتھ کوہاٹ لے گئے ۔ وہاں اس کا کورٹ مارشل ہوا ۔ اس نے اس سے زیادہ بیان نہیں دیا کہ میں مسلمان ہوں اس لیے لڑائی میں میرا فرض ہے کہ مسلمان کا ساتھ دُوں ۔

اسے بارہ سال کی سزائے قید دے دی گئی اور اسے راولپنڈی جیل خانے میں بھیج دیا گیا ——— یہ واقعہ سُنا کر عالم نے مجھے کہا ——— "مجھے قید کا کوئی غم نہیں ۔ میں نے انگریز کا حکم نہیں مانا ، خدا کا حکم مانا ہے ، مجھے اپنی بہن کا غم ہے"۔

مَیں نے اسے کہا کہ تم نے جس خدا کا حکم مانا ہے وہی خدا تمہاری بہن کی حفاظت کرے گا ۔

میں اُس سے رُخصت ہوا ۔ کچہری جیل خانے کے سامنے تھی ۔ میں نے تین چار وکیلوں سے مشورہ کیا کہ عالم کی سزا کے خلاف اپیل دائر کروں گا مگر انہوں نے بتایا کہ کورٹ مارشل کی سزا کے خلاف اپیل نہیں ہوسکتی ۔ صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے رحم کی درخواست ۔

میں واپس آگیا ۔ گاؤں کے بزرگوں کو بتایا تو اُن پر بہت اثر ہوا ۔ سب سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے ۔ ہمیں فوجی قانون کی کچھ خبر نہیں تھی ۔ گاؤں کے دو آدمی جمعدار تھے جنہیں آج کل نائب صوبیدار کہتے ہیں اور ایک صوبیدار تھا ۔ سولہ اور آدمی مختلف عہدوں پر فوج میں تھے ۔ ان میں سے کوئی بھی گاؤں میں موجود نہیں تھا جو ہمیں راستہ دکھاتا ۔ میں نے جیجو کو عالم کے متعلق بتا دیا ۔ جیجو عالم کی ماں بھی تھی اور باپ بھی ۔ اُس کا جو حال ہوا وہ بیان سے باہر ہے ۔ اسے مَیں نے اور میری ماں نے بہت حوصلہ دیا ۔

دو مہینے گزر گئے ۔ ایک روز ہمارے گاؤں میں پولیس کا ایک حوالدار آیا ۔ اُس نے بتایا کہ کل یہاں ایک انگریز میجر بھرتی کے دورے پر آ رہا ہے ۔ اس نے کہا کہ صاحب بہادر کی خاطر تواضع بھی کرنی ہے اور بھرتی ہونے کے لیے کچھ جوان بھی دینے ہیں ۔ نمبرداری ہمارے گاؤں میں تھی ۔ نمبردار تو انگریزوں کے زرخرید غلام ہوتے تھے ۔ ہمارے نمبردار

نے میجر صاحب کے استقبال اور خاطر تواضع کا انتظام شروع کر دیا ۔

پہلی جنگِ عظیم میں بیٹا ، تمہیں معلوم ہوگا کہ ترکوں اور انگریزوں کی جنگ ہوئی تھی ۔ اِدھر ہمارے ملک میں ، خاص طور پر علاقہ پنجاب اور پوٹھوہار کے مسلمان ، دل سے ترکوں کے ساتھ تھے ۔ کچھ مسلمان لیڈروں نے یہ تحریک چلائی تھی کہ مسلمان انگریز کی فوج میں بھرتی نہ ہوں ۔ ایسا بھی ہوا کہ فرنٹ پر بے شمار فوجیوں نے ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اس سے ہندوستان میں انگریزی حکومت بہت پریشان تھی ۔ اُدھر جنگ لگی ہوئی تھی اِدھر ملک کے مسلمان بگڑ گئے ، اس لیے انگریز افسر دیسی افسروں کو ساتھ لے کر کبھی کبھی دیہاتی علاقوں میں جاتے اور دیہاتیوں کو بھرتی کرتے تھے ۔ وہ زبردستی نہیں بلکہ دوستانہ طریقے سے بھرتی کرتے تھے ۔

اسی طرح ایک انگریز میجر دو مسلمان افسروں کو ساتھ لے کر ہمارے گاؤں میں بھی آگیا ۔ ہم نے عالم کی رہائی کے لیے رحم کی درخواست لکھوالی تھی ۔ انگریز آیا تو اس کے لیے مُرغ پکائے اور اسے دُودھ پلایا اور درخواست اس کے آگے رکھ دی ۔ میرے ایک بزرگ نے اسے عالم کے متعلق بتایا کہ وہ یتیم ہے اور اس کی ایک بہن ہی بہن ہے ۔ غیرت والا لڑکا ہے ، اسے معاف کیا جائے ۔ انگریز میجر کو عالم کی ساری داستان سنائی گئی کہ اس کے گاؤں میں اس کی بہن کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا ، اور اس نے اپنی بہن کو وہاں سے کس طرح نکالا تھا ۔

یہ سُن کر انگریز نے کہا کہ جنگ میں حکم عدولی بہت بڑا جرم ہے ۔ ہم نے اسے کہا کہ ہمارے گاؤں کے انیس آدمی فوج میں ہیں ۔ اگر عالم کو معافی دے دی جائے تو ہم گاؤں سے اور بھرتی دیں گے ۔

ہمارے گاؤں کے چودہ جوان بھرتی کے لیے پہلے ہی تیار تھے ۔ ہم نے اُن کو روکا ہوا تھا ۔ کچھ اور جوان قریب کے چھوٹے گاؤوں

کے بھی آ گئے تھے۔ ہم نے ان کو بھی روکا ہوا تھا۔

میجر نے غور کیا اور پوچھا ——— ”تم کتنا جوان دے گا؟“

نمبردار نے جواب دیا ——— ”ستائیس جوان“

میجر نے کہا ——— ”سامنے کرو“

ہم نے اشارہ کیا تو ستائیس جوان سامنے آ گئے۔ میجر نے سب کو دیکھا۔ سارے جوان فوج کے لیے فِٹ تھے۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ عالم کو معافی دلائے گا لیکن یہ اس کی کوشش ہو گی کیونکہ آخری فیصلہ اُس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہم نے اُسے گھوڑ دوڑ اور کبڈی دکھائی اور بہت خاطر تواضع کی۔ وہ شام کو واپس چلا گیا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز جیجو کو اور اپنے تین دوستوں کو میں عالم کی ملاقات کے لیے راولپنڈی لے گیا اور اسے رحم کی درخواست کے متعلق بتایا۔ ہمیں کوئی امید نہیں تھی کہ عالم کو انگریز چھوڑ دے گا۔ ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ انگریز دھوکا دے گیا تھا لیکن جس روز ہم عالم سے ملاقات کر کے واپس آئے اُس کے دو روز بعد گاؤں میں کسی نے بڑی اونچی آواز سے کہا ——— ”عالم آ رہا ہے“۔

میں دوڑ کر باہر گیا۔ عالم آ رہا تھا۔ اس کی سزا معاف ہو گئی تھی لیکن اس کے لیے حکم تھا کہ وہ اب فوج میں یا کسی بھی سرکاری نوکری میں نہیں جا سکتا۔

گاؤں میں سب عالم کی اور زیادہ عزت کرنے لگے۔ اس نے بہت بڑا کارنامہ کیا تھا کہ پٹھانوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ عالم کے خیالات بدل گئے اور اس کی چال ڈھال بھی بدل گئی۔ گردن اُونچی کر کے چلتا تھا اور باتیں بزرگوں کی طرح کرتا تھا۔ اُسے اب کمین یا نیچ ذات کہنا زیادتی تھی لیکن ہمارے ملک میں کوئی آدمی اس زیادتی سے باز نہیں آتا۔ کمین ذات کا کوئی آدمی دماغ اور اخلاق کے لحاظ سے ہم سے کتنا

ہی اونچا کیوں نہ ہو، ہم اُسے نیچ ہی سمجھتے تھے لیکن میرے گھر میں عالم اور جیجو کو اُونچی ذات والی عزت ملتی تھی۔

عالم اپنے کارنامے پر خوش تھا لیکن کبھی کبھی وہ اُداس ہو کر بیٹھ جاتا اور بہن کا رونا شروع کر دیتا۔ اس دوران ایک گاؤں سے اس کی بہن کے لیے رشتہ آیا جو عالم نے قبول نہیں کیا۔ اس کے دماغ میں یہ سما گئی تھی کہ بہن کو عزت دار گھرانے میں بیاہے گا۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنا مکان بنانا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ جس کا اپنا مکان نہیں اس کی کوئی عزت نہیں۔ مکان خواہ ایک کوٹھڑی ہی ہو۔

اللہ بعض بندوں کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ عالم کی عمر ابھی بیس سال پوری نہیں ہوئی تھی۔ ذرا غور کرو اس نے کتنی مصیبتیں برداشت کیں۔ اپنی بہن کو تیرہ سال کی عمر میں کس طرح گاؤں سے نکالا اور ایک آدمی کو قتل کیا۔ پھر اپنی فوج سے برستی گولیوں میں بھاگ کر پٹھانوں سے جا ملنے کی کوشش کی اور بارہ سال کے لیے جیل میں بند ہو گیا لیکن اللہ کارساز ہے۔ اپنے نیک بندوں کو آزماتا ہے اور ان کی نجات کا بندوبست بھی کر دیتا ہے۔ بارہ سال کی سزا معاف ہو جانا معجزہ تھا۔ یہ خدائی مدد کا نتیجہ تھا مگر عالم کے دل میں جو ارادے تھے وہ پورے نہیں ہو رہے تھے۔

خدا نے اُسے ایک اور آزمائش میں ڈال دیا۔ یہ بھی عالم کی قسمت میں لکھا تھا۔ قصہ یوں ہوا کہ ہمارے گاؤں میں ایک مست بھینسا آ گیا۔

اُس زمانے میں مست بھینسے بہت ہوتے تھے۔ دو بھینسے آپس میں لڑ پڑتے تو ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے گاؤں میں جا پہنچتے تھے۔ کوئی آدمی لپیٹ میں آ جائے تو کچلا جاتا تھا۔ مٹی کی دیوار سے ٹکرا جائیں تو دیوار گر پڑتی اور چھت نیچے آ جاتی تھی۔ یہ بھینسے عموماً پالتو نہیں ہوتے تھے۔ گھومتے پھرتے رہتے تھے نہیں دیہاتی نسل کشی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ایسے بھینسے عام طور پر بھینسوں کی طرح چُپ چاپ اور

سیدھے سادے سے رہتے تھے مگر کوئی بگڑ جائے تو لوگ بھاگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

چیت بیساکھ کا موسم تھا۔ یہ موسم جانوروں کے جوبن کا ہوتا ہے۔ مست بھینسے، مست سانڈ اور مست اونٹ اسی موسم میں دیکھنے میں آتے تھے۔ ایک روز میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے باہر گاؤں میں کھڑا تھا۔ اچانک گاؤں میں شور اٹھا ــــ "بچوں کو اندر کر لو بیٹ جاؤ" ــــ اور اس کے ساتھ ایسے لگا جیسے زمین لرز رہی ہو اور فوراً ہی ایک بھینسا غضب سے پھنکارتا دوڑتا ہوا آ گیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اور تیز دوڑا اور سیدھا ہماری طرف آیا۔

ہم سب بھاگے مگر میں گھبرا کر غلط طرف بھاگا۔ آگے ایک مکان کا پچھواڑہ تھا۔ دائیں طرف بھی ایک مکان کا پچھواڑا تھا اور بائیں طرف مٹی کی ایک دیوار تھی جو میرے قد سے ایک فٹ اونچی تھی۔ میں گھر گیا۔ یہ جگہ جو تین طرف سے بند تھی، گلی کی طرح تنگ نہیں تھی۔ پورے مکان کے پچھواڑے جتنی کھلی تھی۔ میں اس جگہ اندھا دھند داخل ہو گیا اور پیچھے کو مڑا۔ بھینسا پانچ چھ گز دور تھا۔ میں ایک طرف سے نکلنے کے لیے دوڑا لیکن بھینسے نے رخ بدلا اور بڑی زور سے پھنکار کر میری طرف آیا۔ میں رکا اور دوسری طرف دوڑا۔ بھینسے نے ادھر ہو کر میرا راستہ روک لیا۔

مجھے بھینسے کے پیچھے تین آدمی نظر آئے جو دور تھے اور گاؤں میں بہت شور مچا ہوا تھا۔ مجھے بھینسے کی خون کی طرح گہری لال آنکھیں اور اس کے سینگ نظر آ رہے تھے۔ سینگ بہت بڑے نہیں تھے لیکن بہت ہی خوفناک تھے۔ ان کی نوکیں برچھیوں کی طرح تیز اور ذرا آگے کو آئی ہوئی تھیں۔ ڈر یہ تھا کہ پیچھے دیوار ہے۔ بھینسے نے ٹکر ماری تو میں دیوار اور بھینسے کے درمیان پس کر بڑی ہی بری موت مروں گا۔ میں نے بلند آواز سے کہا ــــ "کتے کھول دو، سارے کتے کھول دو۔"

ہمارے شکاری کتے بڑے خونخوار اور دلیر تھے لیکن کتوں کا فوراً پہنچنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ بھینسا میرے اوپر آ گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر ایک طرف نکلنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی بھینسا سر نیچے کر کے پہاڑ کی طرح میری طرف آیا۔ میں نے بہت پھرتی کی۔ بھینسے کے سینگوں کی زد سے نکل گیا۔ اس کی ٹکر دیوار پر پڑی۔ میں بچ تو گیا مگر گر پڑا۔ بھینسا بہت زور سے پھنکارا اور ایسی خوفناک آواز پیدا کی کہ میرا کلیجہ ہل گیا۔ وہ پیچھے ہٹا۔ میری ٹانگیں اس کے پاؤں کے قریب تھیں۔ میں ابھی ٹانگیں پیچھے کر کے اٹھنے ہی لگا تھا کہ بھینسے کا ایک پاؤں میرے پاؤں کے پنجے پر آ گیا۔ میں کیسے بتاؤں کہ مجھے کتنی تکلیف ہوئی۔

بھینسا ذرا اور پیچھے ہٹا۔ اب ممکن نہیں رہا تھا کہ میں اٹھتا اور اس کی دوسری ٹکر سے بچتا۔ گرد اتنی اڑی کہ مجھے بھینسے کا سر، سینگ اور آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اس گرد میں مجھے ایسے نظر آیا جیسے بھینسے کے سینگوں کو کسی آدمی نے ہاتھوں سے پکڑ لیا ہے۔ مجھے شاید اس انسان کا دھندلا سا چہرہ بھی نظر آیا تھا مگر میں اسے پہچان نہ سکا۔ پھر میں نے دیکھا کہ بھینسا میری طرف سے منہ موڑ گیا۔

میں تیزی سے اٹھا۔ میری طرف بھینسے کی پیٹھ تھی۔ میں نکل تو آیا لیکن بھاگا نہیں کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ بھینسے نے کسی آدمی کو اپنے سر کے نیچے دبا لیا ہے۔ میرا پاؤں اتنا زخمی تھا کہ اس پر وزن برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میں خالی ہاتھ بھی تھا۔ پھر بھی میں نے منہ نہیں موڑا۔ میں نے بھینسے کے سر کے نیچے ایک آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے بھینسے کی دم پکڑ کر مروڑی تاکہ اس کی توجہ پیچھے کو ہو جائے۔ میرے لیے نکلنے کا راستہ تو بن ہی گیا تھا۔

اتنے میں آٹھ دس آدمیوں نے بھینسے پر کلہاڑیوں سے حملہ کر دیا

اور ہمارے کُتّے بھی آ گئے ۔ میں وہاں سے نکل گیا ۔ بھینسا پیچھے مُڑا اور
پھنکارتا ہُوا کتوں اور آدمیوں پر حملہ کرنے کو دوڑا مگر کتوں نے اس کی
ٹانگوں میں دانت اور پنجے گاڑ دیئے ۔ لوگوں نے اس کے پہلوؤں پر
کلہاڑیوں اور برچھیوں سے حملہ کر دیا ۔ بھینسا بھاگ اُٹھا ۔ کتوں نے اس
کا پیچھا نہیں چھوڑا ۔ چند آدمی بھی اس کے پیچھے گئے تاکہ وہ گاؤں کے اندر
نہ جا سکے اور کوئی نقصان نہ کر دے ۔

میں نے ایک آدمی کو وہاں پڑے دیکھا جہاں سے میں بھینسے کے
آگے گرا تھا ۔ دوڑ کر اسے سیدھا کیا ۔ وہ عالم تھا ۔ اوندھے مُنہ بیہوش پڑا
تھا ۔ اس کی ایک ٹانگ سے خون کا فوّارہ نکل رہا تھا ۔ پیٹھ سے بھی خون
بہہ رہا تھا ۔ دوسرے آدمی بھی آ گئے ۔ چارپائی منگوائی گئی ۔ عالم کو اٹھا کر
چارپائی پر ڈالا ۔ اس کے جسم کو دیکھا ۔ بھینسے کا ایک سینگ اس کے
گھٹنے والے جوڑ سے پار ہو گیا اور ٹانگ اس طرح کٹ گئی تھی کہ ایک جگہ
سے صرف کھال سے اٹکی ہوئی تھی ۔ پیٹھ پر بھی سینگ لگا تھا لیکن جسم میں
داخل نہیں ہُوا ، کھال چیر کر ایک طرف نکل گیا ۔

میری ماں اور عالم کی بہن رو رو کر پاگل ہوئی جا رہی تھیں ۔ فوراً
کورے سُوت کی اٹیاں جلا کر ان کی راکھ عالم کے زخموں پر باندھ دی گئی ۔
گھٹنے کو کپڑوں میں کس دیا گیا اور چارپائی اُٹھا کر ہم بہت سے آدمی شہر
کی طرف چل دیئے ۔ اُس زمانے میں نہ کوئی سڑک تھی نہ کوئی موٹر ۔ سواری
کے لیے اُونٹ ، گھوڑے اور گدھے ہوتے تھے ۔ ہسپتال صرف شہر میں
ہوتا تھا جو گاؤں سے دس میل دُور تھا ۔

ہم عالم کو چارپائی پر ڈالے ہوئے دوڑتے جا رہے تھے ۔ سب
باری باری چارپائی اٹھاتے تھے ۔ علاقہ تم نے دیکھا ہے ۔ کہیں چڑھائی
ہے کہیں اترائی ہے ، ندیاں اور نالے ہیں ۔ ہم دو گھنٹوں بعد ہسپتال
پہنچے ۔ سرکاری ڈاکٹر ہندو تھا ۔ اس نے عالم کے منہ میں کوئی دوائی

ڈالی اور جب اس نے ٹانگ کا زخم دیکھا تو ہمیں بتایا کہ ٹانگ کٹ گئی
ہے ۔ یہ جسم کے ساتھ نہیں رہ سکتی ۔ وہ ہم سے ٹانگ الگ کرنے کی
اجازت لے رہا تھا ۔ ہم نے اسے کہا کہ وہ جو بہتر سمجھتا ہے وہ کرے ۔
اس طرح بیس سال کی عمر میں عالم ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا ۔

ایک مہینے بعد اس کے پیٹھ کے زخم اور کٹی ہوئی ٹانگ کا زخم بھی ٹھیک
ہو گیا ۔ ہم اسے گھوڑے پر بٹھا کر ہسپتال سے گاؤں لائے ۔ اس نے
مجھے بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی ۔ اسے کسی نے
بتایا تھا کہ مددعلی بھینسے کے آگے آ گیا ہے ۔

وہ خالی ہاتھ دوڑ پڑا ۔ میں اُس وقت بھینسے اور دیوار کے درمیان
موت کے منہ سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ میں جب گرا اُس وقت
عالم نے دوسری طرف سے آ کر بھینسے کے سینگوں کو پکڑ لیا اور اس کی گردن
مروڑنے کی کوشش کی لیکن کہاں مست بھینسا اور کہاں انسان ۔ اس
سے عالم کا یہ مقصد پورا ہو گیا کہ بھینسے نے توجہ اُس کی طرف کر دی اور
میں اُٹھ کھڑا ہُوا ۔ اگر عالم اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالتا تو میں زمین پر
پڑا تھا ۔ بھینسا ایک سیکنڈ میں میری انتڑیاں باہر نکال دیتا اور پھر میرا
جسم قیمہ کر دیتا لیکن اس ایک سیکنڈ میں عالم نے اسے اپنا جسم پیش کر دیا ۔
عالم نے اس کے سینگ پکڑ کر اس کی گردن مروڑنے کی کوشش
کی تو بھینسے نے سر کے ایک ہی جھٹکے سے اسے دیوار کے ساتھ پٹخ دیا ۔
وہ جب اُٹھ رہا تھا اس کی پیٹھ اُوپر تھی ۔ بھینسے نے سینگ مارا جو اُس
کی کھال چیر کر گزر گیا ۔ عالم پھر گرا ۔ بھینسے نے اُسے سینگ مارا جو اُس
کے گھٹنے کو کاٹ گیا ۔ اتنے میں میں نے بھینسے کی دم مروڑ کر اسے عالم
سے ہٹا لیا اور اسی وقت آدمی اور ہمارے کتے پہنچ گئے ۔
کُتوں نے بھینسے کو گاؤں سے ایک میل دُور جا کر گرا لیا تھا ۔ اس

کے بعد وہ اُٹھ نہیں سکا۔ وہیں تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ ہمارے کتوں نے اس کی شہ رگ کاٹ دی تھی، مگر بھینسا مرتے مرتے ہمارے دو کتوں کو ساتھ ہی لے مرا۔

عالم ساری عمر کے لیے بیکار ہوگیا۔ اس نے یہ لاٹھی بنالی جس کے ساتھ لکڑی کی موٹی تختی لگی ہوئی ہے اور اس پر گدّا ہے۔ اس شخص نے عمر کے ساٹھ سال اس لاٹھی کے سہارے گزار دیئے ہیں۔ وہ بیس سال کی عمر میں معذور ہوا تھا۔ اس نے میرے احسان کا بدلہ چکایا تھا۔ یہ شخص سارے گاؤں کا غم خوار ہے۔ سارے گاؤں کے بچّے اسے اپنا باپ سمجھتے ہیں اور یہ میری زندگی کا آخری ساتھی ہے۔ ہم ہر وقت اکٹھے رہتے ہیں۔

راجہ مدد علی خان نے یہاں کہانی ختم کردی۔ میں تو یہ سُننے کے لیے بے قرار تھا کہ جیجو کا کیا بنا؟ کیا اسے کوئی عزت دار گھرانہ ملا تھا یا نہیں؟ اور عالم نے مکان بنایا تھا یا نہیں؟

میں نے راجہ مدد علی خان سے یہ دونوں سوال پوچھے تو وہ ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی مذاق والی نہیں بلکہ عجیب سی ہنسی تھی۔ کہنے لگے ——

”ہاں بیٹا! جیجو کو عالم نے اونچی ذات کے گھرانے میں بیاہ دیا تھا۔ اُس کے خاوند نے اسے اپنے گھر کی حکومت اور بادشاہی دے دی تھی۔“

”کون تھا وہ“؟ میں نے پوچھا۔ ”ابھی زندہ ہے“؟

”ہاں بیٹا! راجہ مدد علی خان نے کہا۔ ”وہ ابھی زندہ ہے۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہے ...... جیجو میری بیوی تھی“۔

”تھی“؟

”ہاں بیٹا! نو سال گذرے مرگئی ہے“ —— یہ کہہ کر راجہ مدد علی خان کی آواز دب گئی۔ گھونٹ سا نگل کر کہنے لگے —— ”میرا ساتھ چھوڑ

گئی ہے۔ ہم میں بہت پیار تھا ..... میں نے جب اس سے شادی کرنے کے لیے گاؤں والوں کو کہا تھا تو سب نے مجھے منع کیا تھا۔ کہتے تھے کہ کمین ذات اُونچی حویلی میں نہیں رہ سکتی۔ باپ دادا کی قبروں کی توہین نہ کرو لیکن میں نے کمین ذات کو اُونچی حویلی میں بسا کر دکھا دیا۔ پھر میں نے عالم کو الگ مکان بنوا دیا اور جیجو سے کہا تھا کہ وہ تمہارا میکہ ہے۔ کبھی وہاں رہو کبھی میرے پاس رہو۔ عالم نے اپنی دونوں قسمیں پوری کردیں۔ بہن کو عزت دار گھر میں بسا دیا اور مکان بھی بنوا لیا۔“

پتن پتن کے پاپی

لالو مانجھی اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ چارپائی سے مشکل سے اٹھتا ہے اور باہر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کی عمر ایک سو سال سے زیادہ ہے لیکن پیدائش کا سال اسے یاد نہیں۔ اس نے کہا ——— "میں تو مچھلیوں کی طرح دریا کے اندر ہی کہیں پیدا ہوا تھا۔ باپ مانجھی تھا۔ اس کا باپ بھی مانجھی تھا۔ میں نے ساری عمر دریا میں گزار دی ہے۔ اب میرے بیٹے اور ان کے بیٹے دریا سے روزی کما رہے ہیں"۔

"پھر تو آپ نے بے شمار سیلاب دیکھے ہوں گے"۔ میں نے لالو مانجھی سے کہا ——— "بہت سے انسانوں کو ڈوبتے اور تیرتے دیکھا ہو گا۔ بہتوں کو آپ نے بچایا ہو گا۔ آپ نے بہت سے حادثے دیکھے ہوں گے"۔

"ہاں بیٹا!" اس نے میری بات کاٹ کر کہا ——— "میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ جس طرح یہ دریا کبھی ختم نہیں ہوتا اسی طرح اس کی کہانیاں بھی کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ میری عمر لوگوں کو دریا پار کراتے گذر گئی ہے۔ میں نے دنیا نہیں دیکھی کہ کتنی بڑی ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ جہلم شہر کتنا بڑا ہے۔ میری زندگی اس پتن سے اس پتن تک کشتی کھینچتے گذری ہے۔ میں نے پتن سے پتن تک جو کچھ دیکھا ہے وہ نہ جہلم شہر والوں نے دیکھا ہے نہ

دنیا والوں نے۔ میری کشتی میں لاشوں نے بھی دریا پار کیا ہے اور باراتوں
نے بھی ..... اب تو ہر طرف سڑکیں بن گئی ہیں پُل اتنے ہو گئے ہیں کہ
لوگوں کو کشتیوں کی ضرورت نہیں رہی۔ پتن اُجڑ گئے ہیں۔ میں نے تو وہ زمانہ
دیکھا ہے جب بیڑی پتن دریا پار کرنے والوں سے اَٹے رہتے تھے۔ آدھی
رات کو بھی مسافر آتے جاتے تھے۔"

لالو ماچھی بڑھاپے کی غنودگی میں اُس دور کو یاد کرتے ہوئے بولتا چلا جا
رہا تھا اور میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ بارش برس رہی ہے اور اس کے
رُکنے کی ابھی کوئی امید نہیں۔ میں ماچھیوں کی بستیوں کے قریب سے گذر رہا
تھا۔ ساون کی بارش اچانک برسنے لگی۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو
گیا۔ لالو وہیں بیٹھا تھا۔ اُٹھ کر مجھے کہنے لگا ——— "تم شاید کہیں آگے جا رہے تھے۔
یہ بارش تین گھنٹوں سے پہلے نہیں رُکے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔ مجھے ذرا سہارا
دے لینا۔ اب تیز نہیں چلا جاتا۔"

میں نے اُسے سہارا دیا تو وہ مجھے اپنے گھر لے گیا جو وہاں سے تیس چالیس
قدم دُور تھا۔ اندر چارپائی پر بیٹھتے ہی اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے
والا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔

تعارف ہو چکا تو میں اُس کے متعلق پوچھنے لگا۔ اُس نے بتانا شروع
کر دیا۔ میں نے اسے کہا ——— "باباجان! اپنی اتنی لمبی دریائی زندگی میں آپ
نے بہت سارے واقعات اور حادثات دیکھے ہوں گے۔ کوئی ایسا واقعہ
سنائیں جس نے آپ کے دل پر بہت ہی گہرا اثر کیا ہو۔"

وہ سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، پھر بولا ——— "دریا
کا کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جو دل پر گہرا اثر نہ کرے۔ واقعہ یہی ہوتا ہے
جسے تم حادثہ کہتے ہو کہ کوئی آدمی دریا میں ڈوب گیا۔ کسی آدمی کا ڈوب جانا
معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ میرے سامنے ہزارہا انسان ڈوب چکے ہیں کشتیاں

بھی اُلٹتی رہی ہیں۔ میری جوانی میں ایک بار پوری کی پوری بارات ڈوب گئی
تھی۔ کبھی کبھی پیچھے سے ایک لاش بہتی ہمارے قریب سے گذر جاتی تھی اور
جب سیلاب آتا تھا تو کوئی گن نہیں سکتا تھا کہ کتنے انسان ڈوب گئے ہیں۔"

اُس نے آہ بھری اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "تم اُس وقت پیدا
نہیں ہوئے ہو گے۔ جب یہ دریا خدا کا قہر بن گیا تھا۔ مجھے اپنے پیدا ہونے
کا سن یاد نہیں لیکن سیلاب کا سن اچھی طرح یاد ہے۔ ۱۹۲۳ء تھا۔ ایسا
سیلاب نہ پہلے کبھی آیا نہ پھر کبھی آیا ہے جب شہر آدھا ڈوب گیا تھا۔ لوگ
گھروں میں سوئے ہوئے تھے، سیلاب نے انہیں اُٹھ کر بھاگنے کی مہلت نہیں
دی تھی۔ رات کا دوسرا پہر تھا۔ پیچھے سے گاؤں کے گاؤں بہتے چلے آ
رہے تھے۔"

"اُس وقت آپ اِسی گھر میں تھے"؟ میں نے پوچھا۔ "آپ بھی سوئے
ہوئے ہوں گے۔"

"میں اُس وقت دریا میں تھا۔ سویا ہوا نہیں تھا" ——— اُس نے جواب
دیا ——— "کشتی بڑی نہیں چھوٹی تھی۔ میرے ساتھ دو مسافر تھے۔ ایک نوجوان
لڑکی اور ایک جوان آدمی۔ میں تمہیں انہی کی کہانی سنانے لگا ہوں۔ میں چاندی
کے روپوں کے لالچ میں ان کے گناہ میں شریک ہو گیا تھا۔ خدا نے مجھے
سزا دی لیکن جلدی بخش دیا .....

"قصہ یوں ہے بیٹا! سورج غروب ہونے والا تھا۔ اُس وقت میری
عمر پچاس سال تھی، شاید اس سے ذرا کم یا زیادہ ہو۔ میرے دونو بیٹے بڑی کشتی
لے گئے تھے۔ میں پتن سے تھوڑی دُور دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ وہاں ماہی
گیروں کی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک آدمی ٹہلتا ٹہلتا میرے پاس آیا۔
وہ کسی کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے دو گھوڑا بوسکی کا
کرتہ پہن رکھا تھا اور سر پر مشہدی لنگی تھی۔ وہ میرے پاس آ کے کھڑا ہو گیا اور

اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ گپ شپ لگانے لگا۔
وہ ایسے دوستانہ طریقے سے باتیں کر رہا تھا کہ مجھے وہ بہت اچھا لگا۔
اس کی عمر تیس سے دو تین سال کم ہو گی.....

"اُس نے مجھ سے پوچھا — "ایک پھیرے کے کتنے روپے لو گے؟"
— میں نے اُسے بتایا تو وہ کہنے لگا — "اگر میں اس سے تگنے روپے
دوں تو میرا کام کر دو گے؟" — میں چُپ رہا تو اُس نے کہا — "گھبراؤ
نہیں۔ میں چور ڈاکو نہیں ہوں، سیر سپاٹا کرنا چاہتا ہوں" — میں نے پوچھا
کہ کیا کام ہے؟ اُس نے کہا — "پہلا کام یہ ہے کہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ
تم نے میرا کام کیا ہے اور اصل کام یہ ہے کہ رات کے وقت مجھے دریا پار کرانا
ہے لیکن یہاں سے نہیں۔ یہاں سے دو میل اُوپر کی طرف۔ میرے ساتھ
ایک لڑکی ہو گی۔ کشتی بہتے رُخ نہیں آئے گی۔ ہم اُوپر، دریا کے اُلٹے رُخ
جائیں گے اور دو اڑھائی میل دُور پار لگیں گے۔ میں اللہ پاک کی قسم کھا کر
کہتا ہوں کہ تم ہر طرح محفوظ رہو گے۔ تمہیں کوئی نہیں پکڑے گا".....

"میں نے پوچھا — "لڑکی کون ہے؟ وہ تمہارے ساتھ گھر سے بھاگ
رہی ہے؟" — اُس نے کہا "تم اس کا غم نہ کرو۔ لڑکی کے پیچھے کوئی نہیں
آئے گا۔ میں ذمہ دار ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم بڑی کشتی مسافروں سے بھر کر پار
جانے کے جتنے پیسے کماتے ہو، ان سے تگنے منظور ہیں؟".....

"یہی تو ہماری روزی کا ذریعہ ہے، لوگوں کو دریا پار کرانا۔ کسی آدمی کا
کسی لڑکی کو بھگا لے جانا کوئی عجیب قصہ نہیں تھا۔ ہماری کشتیوں پر ڈاکوؤں
اور رہزنوں نے بھی دریا پار کئے ہیں۔ عورتیں گھروں سے بھاگ کر ہماری کشتیوں
سے دریا پار چڑھی ہیں۔ اب ایک اور امیر زادہ کسی کی بیٹی کو بھگا لے جا رہا تھا۔
میں نے اُسے کہا۔ "تگنے نہیں ہو گئے" — اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ
کر کہا — "میں تمہارا حق زیادہ نہیں ماروں گا۔ پچاس روپے نقد دوں گا"

— میں نے کہا — "مجھے منظور ہے لیکن میں نوٹ نہیں لوں گا۔ ملکہ
کے روپے پُورے پچاس گن کر لوں گا".....

"تم شاید کہو کہ ملکہ کے روپوں میں کیا خاص بات تھی اور شاید تم یہ بھی
کہو کہ پچاس روپے تو بہت تھوڑی رقم ہے..... نہ بیٹا! اُس زمانے کے
پچاس روپے آج کے پانچ سو روپوں کے برابر تھے۔ آج کل شہروں میں لوگ
پچیس روپے من آٹا لیتے ہیں۔ ہم نے اپنے زمانے میں ایک روپے کا پچیس
سیر آٹا کھایا ہے۔ پچاس روپے تو کسی دولت والے کے پاس ہوتے تھے...
اور ملکہ کے روپے کو ہم لوگ اس لیے پسند کرتے تھے کہ یہ خالص چاندی کا
اور پورے تولے کا ہوتا تھا۔ بعض اوقات سنار کے پاس تول کے حساب سے
بیچو تو آنہ دو پیسے فالتو مل جاتے تھے۔ اُس روپے پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر
ہوتی تھی اور دوسرے روپوں پر بادشاہ کی۔ اُس زمانے میں نوٹ بہت کم
ہوتے تھے۔ چاندی کے روپے چلتے تھے"

"تو پچاس روپوں پر آپ کا سودا طے ہو گیا" — میں نے کہا۔

"وہ مان گیا....." بوڑھے مانجھی نے کہا — "اور کہنے لگا کہ ملکہ کے
روپوں کا وعدہ نہیں کرتا، نوٹ نہیں دوں گا..... اُس نے مجھے دریا کے
اُلٹے رُخ تقریباً دو میل دور ایک جگہ بتائی جہاں دریا کا کنارا کٹ کر تھوڑا
اندر کو ہو جاتا تھا۔ وہاں اکٹھے ہی بہت سارے درخت تھے اور اُن کے
ساتھ تھوڑی تھوڑی اُونچی چٹانیں بھی تھیں۔ آدھی رات سے پہلے پہلے مجھے
چھوٹی کشتی وہاں لے جا کر کٹے ہوئے کنارے میں چھپا کر رکھنی تھی۔ اُس نے
کہا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہو گا، کسی وقت بھی لڑکی کو ساتھ لے کر آ جائے گا...

"اُس نے یہ بھی کہا کہ کشتی چپوؤں سے نہیں بلکہ لمبے بانس سے چلے
گی۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ چپوؤں سے پانی میں شڑاپ شڑاپ کی جو آواز
آتی ہے وہ رات کے سناٹے میں دُور تک سنائی دے گی..... میں خود

بھی بانس سے ہی کشتی کھینا چاہتا تھا۔ اُلٹے رُخ چپّو کہاں مارے جاتے ہیں۔ دریا پہلے ہی جوش میں تھا۔ سردیوں کی اور بات ہوتی ہے، دریا مر جاتا ہے.....

"میں نے سوچا کہ آدھی رات کو کشتی اتنی دُور اوپر لے جاؤں اور وہ نہ آئے تو میں نے کیا کمایا؟ میں نے اسے کہا کہ اگر اسے مجھ پر اعتبار ہے تو پچاس روپے ابھی ادا کر دے۔ میں اسے اپنا گھر اور نام بتا دیتا ہوں، دھوکہ دوں تو مجھے پکڑ لے اور اگر رات کو وہ نہ آئے تو رقم میری۔ وہ یہ شرط بھی مان گیا اور مجھے ذرا دُور لے گیا۔ اُس نے کُرتہ اوپر اٹھایا تو میں نے اُس کی کمر کے گرد ایک کپڑا بندھا دیکھا۔ اُسے کھولا تو بہت سے نوٹ اور روپے نکلے۔ اُس نے روپے گِنے تو چھتیس نکلے، باقی سب نوٹ تھے۔ ان میں اکیس ملکہ کے تھے اور باقی بادشاہ کے۔ اس نے پینتیس روپے مجھے دیئے۔ ایک نوٹ دس کا اور ایک پانچ کا دیا۔ میں نے رقم اپنے تہمند سے باندھ کر قبلہ رُو قسم کھائی کہ آدھی رات سے پہلے میں موجود ہونگا...

"میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ لڑکی کو کہاں لے جائے گا؟ وہ خود کہاں کا رہنے والا ہے؟ اور سارا قصّہ کیا ہے؟ ——— اُس نے کہا ——— 'تمہارا اس سے کوئی مطلب نہیں، تم اپنی رقم اور اپنے وعدے سے مطلب رکھو کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دو گے۔ اگر تم نے ہمیں اُس جگہ کنارے لگا دیا جو میں نے بتائی ہے تو دس روپے انعام بھی دُوں گا۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ دریا زوروں پر ہے' ——— میں نے ہنس کر کہا ——— 'دریا کا زور مجھ پر نہیں چلے گا۔ بڑے بڑے ہڑ دیکھے ہیں' ——— پھر وہ چلا گیا.....

"میں نے چھوٹی کشتی کی اچھی طرح دیکھ بھال کر لی اور گھر آ گیا۔ رات کو جب اپنے بیٹے واپس آئے تو انہیں بتایا کہ دریا کا آج کل کوئی بھروسہ نہیں، میں رات کو کسی وقت کشتیاں دیکھ آؤں گا، رسّے نہ ٹوٹ جائیں.....

میرے بیٹوں کو معلوم تھا کہ ہمارا باپ خبطی ہے، جب آنکھ کھلے کشتیاں دیکھنے چلا جاتا ہے۔ انہوں نے مجھ پر کوئی شک نہ کیا۔ وہ تھکے ہوئے تھے، روٹی کا آخری نوالہ مُنہ میں تھا کہ سو گئے۔ میں نے پچاس روپے اُن کی ماں کو دیئے جو اُس نے اُسی وقت مٹی کی ڈولی میں ڈال دیئے.....

"دن بھر مشقت میں جُتے رہنے والوں کی نیند بڑی سخت ہوتی ہے۔ پانی کی مشقت تو جسم توڑ دیتی ہے۔ رات کو مانجھیوں کے گاؤں میں دیکھو تو کہو گے کہ یہ تو لاشیں ہیں...... میں بالکل نہیں سویا۔ آدھی رات سے بہت پہلے چپکے سے باہر نکلا، بانس اٹھایا اور اپنی کشتی تک گیا۔ کشتی کھولی اور دو چار دھکوں سے میں کنارے سے دُور ہٹ گیا۔ اتنے تیز پانی میں اُلٹے رُخ دو میل کشتی لے جانا آسان نہیں تھا، نیند بھی آ رہی تھی لیکن میں کشتی دھکیلتا گیا اور وہ جگہ آ گئی جہاں مجھے کشتی چھپانی تھی۔ وہاں پانی کنارے کو کاٹ کر اندر گیا ہُوا تھا۔ کشتی کو اندر لے گیا......

"وہاں سے میں کنارے پر کود گیا اور رسّے سے کشتی کو کنارے کی طرف گھسیٹا مگر وہاں سے پانی گھوم کر گذرتا تھا اس لیے بھنور کی شکل بن گئی تھی۔ رسّہ باندھنے کے لیے کنارے پر کچھ بھی نہ تھا۔ درخت دُور تو نہیں تھے لیکن رسّہ چھوٹا تھا۔ میں رسّے کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دریا لپک لپک کر مجھ سے کشتی چھین رہا تھا۔ عجیب مشکل تھی۔ رات کے اندھیرے میں کچھ نظر بھی نہیں آتا تھا، نہ میں اس آدمی کو آواز دے سکتا تھا.....

"خدا نے کرم کیا کہ وہ جلدی آ گئے۔ مجھے ان کے قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر میری پیٹھ کے پیچھے سے اس کی آواز سنائی دی ——— 'آ گئے ہو!' ——— میں نے کہا ——— 'جلدی آؤ بھائی' ——— میں نے کشتی کو اور گھسیٹ کر پکڑ لیا۔ اس آدمی نے ایک سوٹ کیس میرے ہاتھ میں دیا اور لڑکی کو بازوؤں میں لے کر کشتی پر چڑھا دیا اور خود بھی کشتی میں چلا گیا۔ وہ بیٹھ گئے

تو میں سوٹ کیس اٹھائے کشتی میں چلا گیا.....

"میں نے بہت جلدی کشتی کو کنارے سے دور کر دیا پھر میں بانس کو پانی میں ڈال کر تہہ پر دباتا تھا اور کشتی ذرا ذرا آگے بڑھتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ پانی کا زور بڑھ رہا ہے۔ ہم لوگ پانی کے کیڑے ہیں، پانی کی بو سونگھ کر بتا دیتے ہیں کہ کیا تبدیلی آنے والی ہے۔ مجھے شک سا ہونے لگا کہ سیلاب آ رہا ہے لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ سیلاب معمولی ہوگا یا زیادہ۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو میں پانی کی رفتار اور رنگ سے صحیح اندازہ کر لیتا..... مجھے ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ آج رات جو سیلاب آ رہا ہے وہ جہلم کا سب سے زیادہ خوفناک سیلاب ہوگا.....

"وہ دونو میری طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے اور میں کشتی کے پچھلے کنارے پر کھڑا بانس کو تہہ میں لے جا کر کشتی کو آگے دھکیل رہا تھا۔ میں لڑکی کے متعلق بھی سوچ رہا تھا کہ یہ گھر سے بھاگ آئی ہے۔ معلوم نہیں شادی شدہ ہے یا کنواری۔ اس کے ماں باپ اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے اور شرم کے مارے کسی سے پوچھتے بھی نہیں ہوں گے کہ تم نے ہماری بیٹی کو کہیں دیکھا ہے؟ لڑکی نے چادر لپیٹ رکھی تھی، اندھیرا بھی تھا اس لیے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس کی عمر کا اندازہ اس کی آواز سے ہو رہا تھا۔ وہ نوجوان تھی، باتیں بھی ایسی بے حیائی سے کر رہی تھی جن سے پتہ چلتا تھا کہ شادی شدہ ہے یا کم از کم کنواری نہیں۔ کنواری لڑکیاں اگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھر سے بھاگ آئیں تو بھی ان میں شرم اور حیا ضرور ہوتی ہے۔ یہ لڑکی بے شرم تھی۔ اسے ذرہ بھر ڈر یا غم نہیں تھا کہ وہ گھر سے بھاگ آئی ہے اور کہیں پکڑی بھی جا سکتی ہے.....

"وہ آدمی تو بالکل ہی بے حیا اور بدکار لگتا تھا۔ اُس نے لڑکی کے ساتھ شرمناک حرکتیں شروع کر دیں اور لڑکی قہقہے لگا لگا کر ہنسنے لگی۔ پھر وہ بھی جواب میں اس کے ساتھ شرمناک حرکتیں کرنے لگی۔ آدمی نے مجھ سے

سوٹ کیس مانگا جو میں نے اُسے اُٹھا کر دے دیا۔ اس نے سُوٹ کیس کھولا۔ اس میں سے کچھ نکالا، تھوڑی دیر بعد مجھے شراب کی بدبو آئی۔ اندھیرے میں مجھے بوتل نظر نہیں آتی تھی۔ وہ کسی بہت بڑے زمیندار کا بیٹا معلوم ہوتا تھا۔ کئی مسلمان زمیندار دیسی شراب پیا کرتے تھے اور بدکاری نوابوں کا مشغلہ تھا.....

"میں کشتی دھکیلتا گیا۔ منزل دُور نہیں تھی مگر پانی کا زور بڑھ رہا تھا یا شاید میں تھک گیا تھا۔ اگر میں تھک گیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کی بے حیائی اور شراب کی بُو نے مجھ میں غصہ بھر دیا تھا.....

"اُس آدمی نے گھُوم کر میری طرف دیکھا اور کہا — 'لو بھائی' دو گھونٹ تم بھی پی لو، جسم میں جان آ جائے گی' — میں نے انکار کیا تو لڑکی نے ہنس کر کہا — 'پاگل ہے جو انکار کر رہا ہے' — اس آدمی نے لڑکی سے کہا — 'تم بھی تو پاگل ہو۔ ایک گھونٹ پی کے دیکھو، بہشت کا نظارہ ہو جائے گا' — لڑکی بولی — 'نہ، نہ، مجھے تو اس کی بُو بھی بُری لگتی ہے' — اُس کے ساتھی نے اُسے زبردستی پلا دی۔ کچھ دیر گذری تو لڑکی نے چادر اتار کر پرے پھینک دی اور اپنے ساتھی سے لپٹ گئی اور پہلے سے بھی زیادہ شرمناک حرکتیں شروع کر دیں.....

"کشتی نے ہلکا سا ہچکولا کھایا تو میں ہوشیار ہو گیا۔ فوراً ہی ایک اور ہچکولے نے کشتی کو اوپر اُٹھا کر گرایا۔ میں نے بیٹھ کر ستاروں کی روشنی میں پانی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے لہریں نظر آئیں۔ میں نے کشتی کو کنارے کی طرف کرنا شروع کر دیا.....

"اچانک کشتی بہت اُوپر اٹھی اور آگے سے نیچے ہو کر گری، پھر اُٹھی اور پھر گری اور میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے جلدی سے کنارے کے ساتھ ہونا چاہیئے کہ دُور سے مجھے ایسا شور سنائی دینے لگا جیسے بہت سی ریل گاڑیاں بھاگی آ رہی ہوں۔ شور ہوا کی رفتار سے ہم تک پہنچ گیا۔ کشتی اتنی زور سے

اُوپر کو گئی کہ میرے ہاتھ سے بانس چھوٹ گیا اور دریا میں جا پڑا اور کشتی بہت
ہی تیزی سے پانی کے رُخ کو بہنے لگی .....

"سیلاب چڑھ رہا تھا۔ لہروں کا شور اتنا کہ دماغ پھٹ رہے تھے۔
کشتی ایک بار پھر اُوپر گئی۔ مجھے لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ کشتی بہت بڑی لہر پر چڑھ
گئی تھی مگر آگے کرنے کی بجائے گھوم کر ایک ہی جگہ ناچنے لگی، پھر اچانک
گری اور ایک لہر نے اوپر جا کر کشتی کو دبا لیا۔ آدھی سے زیادہ کشتی پانی سے
بھر گئی۔ اب سیلاب سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر
دیکھا، اندھیرے میں مجھے جو کنارے نظر آ رہے تھے وہ اب غائب ہو چکے تھے...

"کشتی اب اوپر جا جا کر گرتی تھی۔ لڑکی اور اُس کا ساتھی ایک دوسرے
سے لپٹ گئے تھے۔ آدمی مجھے پکار پکار کر پوچھ رہا تھا کہ میں انہیں بچا سکوں
گا یا نہیں۔ میں نے چلّا کر کہا —— "کم بختو! تمہیں بدکاری کے لیے دریا ہی
ملا تھا۔ یہ خدا کا عذاب ہے۔ پانی پر گناہ کرنے والو! خدا سے نجات مانگو"۔
مگر خدا سخت ناراض تھا۔ ایک لہر نے کشتی کو اٹھایا تو پورے کے پورے درخت
نے کشتی کو دبوچ لیا۔ یہ درخت سیلاب میں بہتا آ رہا تھا۔ میں کشتی سے سیلاب
میں جا پڑا لیکن درخت کی ایک موٹی شاخ کو میں نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کشتی
ڈوب گئی تھی اور ان دونوں کی مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں درخت کو
پکڑے ہوئے تیرنے لگا اور تیرتے تیرتے میں شاخوں کے ذریعے درخت
کے اوپر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اُوپر چلا گیا اور ایک موٹے ٹہن
کو بازوؤں میں جکڑ لیا مگر سیلاب کے زور سے درخت کا اُوپر کا حصّہ نیچے
آ گیا اور نیچے کا اُوپر ہو گیا.....

"میں ڈوب گیا۔ سانس روک کر میں نے سطح پر آنے کی کوشش کی
تو اُوپر سے درخت نے مجھے نیچے ہی دبائے رکھا۔ اگر میں تیراک اور ماجھی نہ
ہوتا تو وہیں ڈوب کر مر جاتا۔ میں پانی کے نیچے زور لگا کر ایک طرف ہو گیا

اور اُوپر اُٹھ آیا اور درخت کا خیال چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میری یہ حالت ہونے
لگی کہ لہریں مجھے گیند کی طرح اُوپر اچھالنے لگیں۔ میں نے جسم ڈھیلا چھوڑ
دیا۔ صرف یہ احتیاط کی کہ پانی ناک یا منہ کے راستے اندر نہ چلا جائے.....

"میں نے کئی سیلاب دیکھے تھے مگر یہ سیلاب بہت ہی ظالم تھا۔ میں
کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش کرتا تھا تو لہریں مجھے اٹھا کر آسمان پر لے
جاتیں اور وہاں سے گرا دیتی تھیں۔ وہ مجھے کنارے کی طرف جانے نہیں
دے رہی تھیں.....

"میرا سر چکرانے لگا اور میں ہار گیا۔ میرا گاؤں بہت دُور پیچھے رہ گیا تھا۔
مجھے بالکل ہوش نہیں کہ جہلم کے دونوں پُل، ریل کا اور سڑک کا، کس وقت
گزرے۔ اُس وقت جہلم پر یہی دو پُل ہوتے تھے۔ آگے دریا چوڑا ہو گیا تو
لہریں بھی پھٹنے لگیں۔ میں نے ٹوٹے ہوئے جسم کا سارا زور لگا کر ایک طرف
کو تیرنے کی کوشش کی تو میں کچھ کچھ کامیاب ہونے لگا مگر دریا تو بہت
ہی پھیل گیا تھا.....

"آخر میرا زور بالکل ہی ختم ہو گیا۔ بازو اور ٹانگیں اکڑ گئیں اور میں نے
اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا۔ پوری کوشش کرتا رہا کہ منہ پانی سے باہر
رہے..... آگے جا کر جب بچنے کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں تو مجھے پاؤں
کے نیچے زمین محسوس ہوئی۔ میں نے پاؤں زمین پر لگا دیئے اور جب میں
کھڑا ہوا تو پانی میری کمر سے ذرا اُوپر تھا۔ میں بائیں طرف کو زور لگا کر چلنے لگا...

"پانی کا زور تو وہاں بھی تھا لیکن میں پاؤں جما کر مقابلہ کرنے کے قابل
ہو گیا تھا۔ میں دراصل کھیتوں میں تھا۔ کرتے کرتے پانی میرے گھٹنوں تک
آیا اور میں ایک درخت کے تنے سے ٹکرا کر رُک گیا۔ میں تنے کو پکڑ کر درخت
پر چڑھ گیا۔ اُوپر تنے سے تین چار ٹہن ایک ہی جگہ سے شروع ہوتے تھے۔
میں اُس جگہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ جسم کے سارے جوڑ درد کر رہے تھے اور

سانسیں بھول گئی تھیں۔ بیٹھنے کی جگہ اتنی اچھی تھی کہ میں نے پیٹھ پیچھے کی تو مجھے ٹہن کا سہارا مل گیا۔ میں بچ گیا تھا۔ میرے دل پر کوئی خوف نہیں تھا۔ ہم دریاؤں سے ڈرنے والے انسان نہیں ہیں۔ البتہ میری جگہ کوئی اور ہوتا جو دریا میں کبھی نہ اترا ہوتا تو وہ دہشت سے ہی مر جاتا...... میں نے پیٹھ پیچھے لگائی اور اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے فوراً نیند آ گئی.....

"صبح آنکھ کھلی تو سورج اوپر آ گیا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میں جاگا نہیں بلکہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، صرف پانی نظر آتا تھا۔ نیچے دیکھا تو پانی مجھ سے دو گز دور تھا۔ تنا پانی میں تھا۔ مجھے جہلم شہر نظر آ رہا تھا جو سات آٹھ میل دُور تھا۔ جو گاؤں کنارے کے ساتھ تھے بہہ گئے تھے۔ میں ابھی نیچے نہیں اترنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے نیچے کھیت ہیں لیکن خطرہ یہ تھا کہ کہیں نہ کہیں کنواں ضرور ہوگا۔ میں درخت پر ہی بیٹھا خدا کے قہر کو دیکھتا رہا.....

"وہ سارا دن اور اگلی ساری رات درخت پر ہی گزری۔ صبح آنکھ کھلی تو پانی اُتر گیا تھا۔ کھیتیاں ننگی ہو گئی تھیں لیکن میں نے جو کچھ دیکھا وہ کبھی نہ بھول سکوں گا۔ پچاس سال گذر گئے ہیں، مجھے ایک ایک چیز یاد ہے۔ کھیتوں میں جگہ جگہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ مویشی بھی مرے پڑے تھے۔ سیلاب نے کسی کا کچھ نہیں چھوڑا تھا.....

"میں نیچے اترا اور کیچڑ میں چل پڑا۔ میں نے اُس آدمی اور لڑکی کے متعلق سوچا تو اُن پر لعنت بھیجی۔ انہوں نے بہتے پانی پر گناہ کیا تھا۔ سزا ہزاروں بے گناہ لوگوں کو ملی.....

"اپنے گھر تک پہنچتے شام ہو گئی لیکن میرا گھر غائب تھا۔ ہماری کشتیاں اور مکان بہہ گئے تھے۔ جانی نقصان بہت تھوڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری برادری کو پہلے خبر ہو گئی تھی کہ سیلاب آ رہا ہے..... تباہی کا قصہ

بڑا لمبا ہے۔ جہلم شہر میں بہت نقصان ہوا تھا۔ مکان گر پڑے اور لوگ دب کر بھی مرے اور گلیوں میں ڈوب بھی گئے تھے.....

"کوئی ایک مہینہ لگا کہ ہم نے اپنی جھگیاں پھر کھڑی کر لیں اور کشتیاں بنانے لگے۔ بہرحال فاقے کر کر کے ہم پھر روزی کمانے کے قابل ہو گئے اور بیڑی پتن پھر آباد ہو گئے۔ دریا پار کرنے کے لیے قریب اور دُور کے دیہات کے لوگ آتے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ ان کی زبانی ہمیں دُور دراز کے علاقوں کی خبریں ملتی رہتی تھیں.....

"ایک روز مسافروں کی زبانی میں نے سُنا کہ تیس پینتیس میل دُور ایک گاؤں میں ایک نوجوان آدمی اور ایک جوان عورت کو ایک ہی وقت قے آنے لگی۔ ان کا رنگ نیلا ہو گیا اور تین چار گھنٹوں بعد دونوں مر گئے۔ سیانوں نے کہا کہ انہیں زہر دیا گیا ہے۔ سرکاری ڈاکٹر بہت دُور تھا۔ لاشیں اُس کے پاس لے گئے تو اُس نے بھی کہا کہ انہیں زہر دیا گیا ہے۔ پولیس کو رپورٹ ہوئی مگر آج تک قاتلوں کا کھرا کھوج نہیں ملا۔ قاتلوں کے متعلق کسی کو شک نہیں تھا۔ آدمی کو اس کی بیوی نے اور عورت کو اس کے خاوند نے زہر دیا تھا۔ ثبوت یہ ہے کہ دونوں ان کے مرنے سے پہلے ہی غائب ہو گئے اور آج پانچ مہینے ہو گئے ہیں دونوں لاپتہ ہیں.....

"میں نے یہ بات سُنی تو میں کریدنے لگا۔ پتہ چلا کہ جس عورت کو زہر دیا گیا ہے اُس کی شادی ہوئے سات سال ہو گئے تھے اور جس نوجوان آدمی کو زہر دیا گیا اُس کی شادی ہوئے ابھی صرف پانچ مہینے ہوئے تھے۔ اس کی بیوی کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی اور وہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ یہ سب ایک ہی برادری کے تھے۔ ان کی یہاں بہت ساری زمین تھی اور نہری علاقے میں مربعے بھی تھے جو انہیں انگریز کی طرف سے ملے تھے۔ بڑی امیر کبیر برادری تھی۔ مرد عیاشی کے عادی تھے۔ کسی بچے کا ختنہ ہو یا کسی کی منگنی کریں، شہر سے رنڈیاں بلا کر نچاتے اور شراب پیتے تھے۔ ایسی عیاشیاں اپنی عورتوں کے

سامنے کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اپنی عورتوں پر پابندی بھی لگاتے تھے...

"اپنے خاوند کو زہر دینے والی لڑکی کا تعلق اُس آدمی کے ساتھ تھا جس نے اپنی بیوی کو زہر دیا تھا۔ لڑکی اٹھارہ انیس سال کی تھی اور آدمی تیس سال کا۔ لڑکی بہت خوب صورت اور شوخ تھی۔ شادی سے پہلے بھی ان دونوں کا تعلق تھا۔ وہ اس آدمی کے گھر آتی جاتی تھی۔ ایک روز اُس آدمی کی بیوی اور اُس لڑکی کی لڑائی ہوگئی نوبات مردوں تک پہنچی۔ مرد لاٹھیاں اور پستول اٹھائے باہر آگئے۔ مرا تو کوئی نہیں، تین آدمی زخمی ہوئے۔ پھر بڑوں نے اور ان کے پیر صاحب نے ان کا راضی نامہ کرا دیا.....

"اس کے بعد اُس آدمی کی اپنی بیوی کے ساتھ روزمرّہ کی لڑائی شروع ہوگئی۔ ساری برادری میں یہ عورت بہت شریف تھی۔ اُس نے اپنے خاوند کو کہہ دیا کہ اس گھر میں یہ لڑکی نہیں آئے گی۔ اس لڑکی کو جس نے خاوند کو زہر دیا ہے ماں باپ نے فوراً بیاہ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح پابند ہو کر ٹھیک ہو جائے گی لیکن سُنا تھا کہ اس نے اپنے خاوند سے یہ الفاظ کہے تھے ___ "اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجھے کسی بہانے طلاق دے دو یا مجھے جان سے مار ڈالو"......

"ان دونوں کی ایک روز بھی نہ بنی۔ لڑکی نے پانچ مہینوں میں شاید صرف پانچ دن اپنے سُسرال میں گذارے ہوں گے۔ وہ اُس آدمی سے ملتی رہتی تھی۔ اُدھر اُس آدمی کی بیوی نے طوفان کھڑا کر رکھا تھا......

"ایک رات گاؤں میں ایک شادی تھی۔ بہت رونق بنی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ لڑکی کو خاوند نے کھیتوں میں جا پکڑا ہے اور اُسے مارا پیٹا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ پانچ چھ دنوں بعد اُس آدمی کی بیوی اور اس لڑکی کے خاوند کو قے آئی اور دونوں چند گھنٹوں میں مر گئے۔ اس سے کچھ دیر پہلے آدمی اور لڑکی غائب ہوگئے تھے۔ گاؤں میں ہر کوئی رو رہا تھا۔ اس نوجوان آدمی کی ماں جب اُس کا سہرا ہاتھ میں لے کر بین کرتی تھی تو گاؤں کی عورتوں کی

چیخیں نکل جاتی تھیں، پتھر بھی کانپ جاتے تھے.....

"میں نے اپنی بیوی کو زہر دینے والے آدمی کا حلیہ پوچھا تو مجھے یہ سولہ آنے وہی آدمی لگا جس نے لڑکی کو بھگا کر میری کشتی میں بٹھایا تھا۔ دن پوچھے تو پتہ چلا کہ جس رات سیلاب آیا اس سے وہ ایک رات پہلے غائب ہوئے تھے...... میں نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے اور یہ بھید سینے میں دبا لیا کہ میں دونوں قاتلوں کو جانتا ہوں۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ دونوں کو قدرت وہی سزا دے چکی ہے جو انہیں ملنی چاہیئے تھی اور ان کی لاشوں کو دریا کھا گیا ہے یا کہیں گدھ اور گیدڑ کھا چکے ہوں گے۔ قدرت سزا ضرور دیتی ہے خواہ کسی رنگ میں دے۔"

لالو مانجھی نے گہرا سانس لیا اور کہنے لگا ___ "کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ تین چار سال بعد کا واقعہ ہے۔ رات ابھی اندھیری ہوئی تھی کہ ایک مانجھی میرے پاس آیا۔ میں چونکہ برادری میں سب سے بڑا تھا اس لیے کوئی ایسی بات ہو تو مانجھی مجھے آ کے بتاتے تھے۔ اُس مانجھی نے بتایا کہ ایک لڑکی نے شام سے ذرا پہلے اس سے پوچھا تھا کہ دو سواریوں کو چھوٹی کشتی میں پتن سے دُور سے پار چڑھانے کے کتنے پیسے لوگے؟ میں نے پوچھا کہ دوسری سواری کہاں ہے تو اس نے بتایا کہ ابھی آئی نہیں ہے۔ یہ لڑکی ابھی تک چھوٹی کشتیوں کے قریب گھوم پھر رہی ہے۔ میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ وہ پریشانی کے عالم میں وہیں پھر رہی ہے.....

"میں باہر نکل گیا۔ باہر جا کر دیکھا تو ایک عورت چادر لپیٹے ہوئے دریا کے کنارے کھڑی نظر آئی۔ میں نے جاتے ہی پوچھا ___ "تم پار جانا چاہتی ہو؟" ___ اس نے کہا ___ "ہاں، لیکن دوسری سواری کو آ لینے دو" ___ اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا ___ "دوسری سواری نہیں آئے گی یا اُس نے کوئی اور جگہ بتائی تھی؟" ___ اُس کے منہ سے نکل گیا ___ "دوسری

جگہ بھی دیکھ آئی ہوں۔ اُسے آنا تو وہیں تھا" .....

"مجھے دال میں کالا نظر آیا۔ مَیں نے اُسے پیار سے کہا ___ "میں تمہیں پار چڑھا دوں گا۔ گھبراؤ نہیں مجھے اپنا باپ سمجھو۔ چلو اُس جگہ چلے چلتے ہیں جہاں اُس نے تمہیں کہا تھا کہ وہ آجائے گا" ___ وہ گھبرا گئی اور بولی ___ "تمہیں کس نے بتایا ہے کہ وہ مرد ہے؟" ___ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ___ "بیٹی! قریب ہو کر میرا چہرہ دیکھو، اندھیرے میں تمہیں میرے سفید بال نظر نہیں آئیں گے۔ میں تمہیں پھر یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ دھوکا نہیں دوں گا۔ میری بات کان کھول کر سُنو، جو اس وقت تک نہیں آیا وہ کبھی نہیں آئے گا۔ مرد پہلے پہنچا کرتے ہیں یا ساتھ آیا کرتے ہیں۔ وہ ڈر گیا ہے، بزدل ہے وہ ..... چلو میرے ساتھ اُس جگہ جہاں اُس نے کہا تھا کہ آجاؤں گا" ___ لڑکی نے کہا ___ "کتنے پیسے لوگے؟ مُنہ سے مانگو، روپے مانگو گے تو روپے دوں گی، زیور مانگو گے تو خالص سونے کا زیور دوں گی" ___ میں نے پھر ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور کہا۔ "باپ اپنی بیٹی سے اُجرت نہیں لے گا" .....

"وہ میرے ساتھ دریا کے اُوپر کے رُخ چل پڑی۔ مَیں نے اُس کے دل کا بھید معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ ٹال مٹول کرتی رہی۔ اُسے مجھ پر اعتبار ضرور آگیا تھا .....

"چلتے چلتے وہ مجھے دو میل دُور بالکل اُسی جگہ لے گئی جہاں سے مَیں نے چار سال گزرے اُس آدمی کو لڑکی کے ساتھ کشتی میں بٹھایا تھا۔ چوری چھپے بیٹھنے کے لیے وہ جگہ بہت اچھی تھی۔ وہ وہاں رُک گئی اور بولی کہ اُسے یہاں آنا تھا۔ میں نے وہ جگہ دیکھی تو میرا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے چار سال پہلے کی قیامت یاد آگئی۔ میں بہت بے تاب ہوا کہ اسے کہوں کہ دیکھو لڑکی، ماں باپ کی عزت کو مٹی میں ملا کر بھاگنے والی لڑکیاں یہاں سے

دریا پار نہیں کر سکتیں۔ تم فوراً چلی جاؤ اور ماں باپ کے قدموں میں جا کر سر رکھ دو۔ مگر مَیں اُسے کچھ نہیں کہہ سکا کیونکہ وہ امیرزادی معلوم ہوتی تھی اور مجھے غریب ملاح سمجھ کر بار بار روپوں اور زیور کا لالچ دیتی تھی۔ وہ جوان تھی اور خوبصورت بھی .....

"ہم وہاں بیٹھ گئے اور رات گذرتے گذرتے آدھی گذر گئی۔ وہ بار بار اُٹھ کر اِدھر اُدھر جاتی اور پھر میرے پاس آ بیٹھتی تھی۔ آخر وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ میں نے اُسے تسلی دلاسا دیا تو وہ رو رو کر بے حال ہونے لگی۔ قصّہ مختصر یہ کہ وہ ہار گئی اور میرے پیار اور شفقت نے اس پر ایسا اثر کیا کہ وہ دل کی باتیں اُگلنے لگی۔ وہ آخر عورت ذات تھی، گھر سے بھاگی ہوئی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ اُس کا آشنا اُسے دھوکا دے گیا تھا۔ اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ میں نے باتوں کے جادو سے اُس کے دل کی باتیں معلوم کر لیں۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک عیّاش خاندان کی لڑکی ہے۔ جب اس نے اپنے خاندان کے مردوں کی عیّاشی کی باتیں سنائیں تو وہی باتیں تھیں جو مَیں سُن چکا تھا۔ اس نے کہا کہ ہمارے مردوں نے ہمیں بھی گمراہ کر دیا ہے .....

"مَیں نے کہا ___ "وہ شاید تمہارا ہی خاندان تھا جس کے ایک آدمی نے چار پانچ سال گزرے اپنی بیوی کو زہر دے کر مارا تھا اور ایک نوجوان لڑکی اپنے خاوند کو زہر دے کر اُس کے ساتھ بھاگ گئی تھی" ___ لڑکی نے میری طرف دیکھا اور اُداس سے لہجے میں کہنے لگی ___ "میں آج اُسی کے گناہ کی سزا بھگت رہی ہوں۔ وہ آدمی میرا بڑا بھائی تھا جس نے اپنی اتنی نیک اور شریف بیوی کو زہر دیا تھا۔ یہ اُس لڑکی کا جادو چلا تھا۔ وہ لڑکی تو ایک خوبصورت کتیا تھی ...... اللہ جانے انہیں زمین نگل گئی ہے یا کہاں چلے گئے ہیں۔ پولیس نے سارا ملک چھان مارا ہے" .....

"میں نے کہا ـــــ 'زمین نہیں انہیں اس دریا نے نگل لیا تھا'۔ میں نے اُسے ساری بات سنا دی پھر کہا ـــــ 'سُنو بیٹی! تم گھر چلی جاؤ۔ گھر سے بھاگنے والوں کو اس دریا کے سوا کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ تمہارا دوست اب نہیں آئے گا'.....

"اُس نے آہ بھر کر کہا ـــــ 'ہاں اب تو نہیں آئے گا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ مرد نہیں، بزدل ہے۔ وہ میرے خاندان اور میری ذات کا آدمی نہیں، کمین ذات کا ہے۔ گاؤں کے درزی کا بیٹا ہے۔ وہ کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ اُس کا جسم لوہے کا بنا ہُوا ہے۔ مجھے اُس کا جسم بہت اچھا لگتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا تعلق اس کے جسم کے ساتھ تھا' ـــــ اب لڑکی تھک ہار کر اس طرح بول رہی تھی جیسے خواب میں بول رہی ہو۔ اپنے آپ ہی اپنے سینے سے گناہوں کے زہر کو اگل رہی تھی۔ کہنے لگی ـــــ 'ہمارے مرد کبھی کبھی گھر میں رنڈیاں نچاتے تھے اور شراب پی کر انہیں روپے دیتے اور ان کے ساتھ بے شرمی کی حرکتیں کرتے تھے۔ میرا بھائی تو بہت ہی عیاش تھا۔ جس لڑکی کے ساتھ وہ گھر سے بھاگا تھا وہ ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ دو تین بار میں گھر میں اکیلی تھی۔ جب یہ لڑکی آئی تو میرے بھائی نے اسے کمرے میں لے جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اُس وقت میری عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ میرے کچے دماغ نے سوچا کہ یہی زندگی ہے۔ میں نے درزی کے اس کڑیل بیٹے کو دل میں بٹھا لیا۔ جب میں بڑی ہوئی تو میری منگنی اپنی برادری میں ہو گئی۔ میں کسی سے کہہ نہ سکی کہ میں تو درزی کے بیٹے سے شادی کر چکی ہوں۔ میں نے اسے بھاگ چلنے کو کہا تو وہ مان گیا۔ میں اس جگہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ کئی بار گھوڑی پر ادھر سے گزر کر پتن سے کشتی پر دریا پار کیا ہے۔ میں رات کے پچھلے پہر گھر سے زیور اور رقم چرا کر نکلی تھی۔ آج دوپہر یہاں پہنچی ہوں۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ شام سے پہلے پہنچ جائے گا مگر نہیں آیا... اب تو نہیں آئے گا'.....

"میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔ وہ نہ مانی۔ کہنے لگی ـــــ 'اب گئی تو گھر والے مجھے جان سے مار دیں گے' ـــــ ذرا سوچ کر بولی ـــــ 'تم جاؤ کشتی لے آؤ' ـــــ اُس نے ایک پوٹلی میرے آگے رکھ دی اور کہا ـــــ 'اس میں رقم اور زیورات ہیں۔ جو جی چاہے اٹھا لو، مجھے پار چڑھا دو یہیں سے'.....

"میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ پار کس کے پاس جائے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ کشتی لے آتا ہوں لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کشتی نہیں لاؤں گا۔ جہاں جاتی ہے چلی جائے۔ میں پہلے دو گناہگاروں کے ساتھ سزا بھگت چکا تھا..... میں اُٹھ کر چل پڑا۔ بیس پچیس قدم دُور گیا ہوں گا کہ مجھے پانی اُچھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں دوڑ کر پیچھے گیا۔ راستے میں ہی رک کر دریا میں دیکھا۔ کوئی پانی میں شڑاپ شڑاپ کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح نظر آ گیا کہ کوئی انسان ڈوب رہا ہے.....

"میں اس جگہ دوڑ کر پہنچا جہاں لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ دراصل مجھے کشتی لانے کے بہانے وہاں سے بھیج کر دریا میں کُود جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے اندھیرے میں دریا کی طرف دیکھا۔ پانی معمول کے مطابق بہہ رہا تھا اور اُس نے ایک اور گناہگار کو نگل لیا تھا ـــــ لڑکی نے ڈوب کر خودکشی کر لی تھی.....

"بیٹا! تمہیں شاید یقین نہ آئے، کہو گے کہ غریب مانجھی جھوٹ بولتا ہے۔ میرا اللہ گواہ ہے کہ مجھے زیورات اور رقم کی پوٹلی وہیں پڑی ملی جہاں اُس نے میرے سامنے رکھی تھی۔ وہ شاید یہ دولت میرے لیے چھوڑ گئی تھی۔ اچانک میری آنکھوں کے آگے کوئی چیز چمکی۔ میرا دماغ روشن ہو گیا۔ میں نے پوٹلی اُٹھائی اور زور سے دُور دریا کے اندر پھینک دی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا ـــــ 'اسی سونے اور روپوں نے انسانوں کو بدکار بنایا ہے۔ یہ جاگیریں

اور مرتا بنے مردوں کو اندھا اور بے غیرت بنا رہے ہیں۔ خاندان کی آبرو اس دولت نے خاک میں ملا دی ہے۔ بھائی کسی کی بہن کو گھر سے بھگا لایا اور بہن کسی کے پیچھے بھاگ گئی۔ جس پتن پر بھائی نے پاپ کیا اسی پتن پر بہن نے گناہوں کا کفارا ادا کیا۔ یہ دھن دولت کی لعنت ہے‘‘ —— اور میں آہستہ آہستہ دریا کے کنارے کنارے پتن کی طرف چل پڑا‘‘۔

یہ دُلہن امانت تھی

لالو مانجھی نے اپنی عمر ایک سو سال سے زیادہ بتائی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ مَیں تو مچھلیوں کی طرح دریا کے اندر ہی کہیں پیدا ہوا تھا۔ باپ بھی مانجھی تھا۔ جس طرح یہ دریا ختم نہیں ہوتا اسی طرح اس کی کہانیاں بھی ختم نہیں ہوتیں۔

اُس روز میں اُس سے ایک ہی کہانی سُن کر اُٹھ آیا تھا کیونکہ مجھے بہت جلدی دریا کے پار جانا تھا۔ تیسرے روز جب میں واپس آیا تو اپنے گاؤں جانے سے پہلے لالو مانجھی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ اس قدر بوڑھا ہو چکا ہے کہ اس کی زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ساری کہانیاں اس دنیا سے اپنے ساتھ ہی لے جائے، میں اس کے ہاں ایک بار پھر چلا گیا اور دو کہانیاں اور سُن آیا۔

اُس نے ایک کہانی شروع کرتے ہوئے کہا —— ’’دریائے جہلم اب میری طرح بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہم جوان تھے تو دریا بھی جوان تھا۔ جوش میں آتا تھا تو کناروں کو ڈبو کر سمندر بن جاتا تھا۔ درختوں کے جنگل، مویشیوں کے ریوڑ اور انسانوں کی بستیاں بہا لے جاتا تھا۔ اس دریا نے پوری پوری باراتوں کو ڈبو دیا ہے۔ زیورات سے لدی ہوئی دُلہنیں اس ظالم دریا کی نذر ہو گئی ہیں۔ ہم نے ماؤں کی لاشیں اس حالت میں بھی بہتی دیکھی ہیں کہ دودھ پیتے بچوں کی لاشیں ان کے سینوں سے لگی ہوئی تھیں اور ماؤں کی

لاشوں نے انہیں بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا ..... اور جب سیلاب اُتر جاتا تھا تو دریا کے ارد گرد کا منظر کوئی مضبوط دل والا ہی دیکھ سکتا تھا۔ لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک بار ایک لاش دیکھی جس کی گردن کو ایک مرے ہوئے بندر نے پکڑ رکھا تھا.....

"ہماری مانجھی برادری کا یہ ایمان تھا کہ سیلاب سے کسی ایسی عورت کی لاش نکالیں جس کے ساتھ زیورات ہوں یا ایسے آدمی کی لاش جس سے نقدی برآمد ہو، ہم زیور اور نقدی اپنے اوپر حرام سمجھتے تھے۔ خدا ہمیں اسی دریا سے روزی دیتا تھا۔ ہمارے بچوں کو یہی دریا پالتا تھا بلکہ مجھ سے پہلے کی ایک نسل ایسی بھی تھی جو خدا سے زیادہ دریا کو ان داتا مانتی تھی۔ ہر سال چڑھاوے چڑھاتی اور دریا کو دیوتا سمجھتی تھی۔ وہ شاید ہندو تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ ہم نے بھی دریا کی اتنی ہی پوجا کی جتنی ہمارے دادا پردادا کرتے تھے لیکن ہم نے خدا کو اپنا نگہبان سمجھا اور پانی کی بہت قدر کی۔ ہمارا ہمیشہ ہی یہ عقیدہ رہا ہے کہ جس نے پانی میں بددیانتی کی اسے پانی نے ضرور سزا دی۔"

لاٹو مانجھی نے کہا ــــ "اب تو ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ بے ایمانی نہ کرو تو بچوں کا پیٹ بھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دن دہاڑے گناہ ہوتے ہیں شریف آدمی کی عزت نہیں رہی ..... میں نے تمہیں سیلاب کی ایک کہانی سنائی تھی۔ اس سے چھ سات سال پہلے ایسا ہی سیلاب آیا تھا۔ اُس وقت میری عمر بیس سال تھی یا بائیس سال۔ دریا جب بھی چڑھتا تھا لوگ کہا کرتے تھے کہ اس سے پہلے ایسا قیامت کا سیلاب کبھی نہیں آیا لیکن ہر سیلاب اُن لوگوں کے لیے قیامت ہوتا تھا جو مکانوں اور مویشیوں سمیت بہہ جاتے تھے.....

"اُس وقت ہماری یہ بستی دریا سے دور آباد تھی۔ رات کو دریا چڑھنے لگا۔ صبح تک سمندر بن گیا۔ میری طرح بستی میں پندرہ بیس نوجوان تھے۔ ہم لنگوٹ کس کر پانی میں جہاں تک جا سکتے تھے گئے تاکہ ڈوبتے ہوئے انسانوں کو بچا

سکیں۔ ہم کنارے تک نہیں جا سکتے تھے، وہاں پانی کا جوش بہت ہی زیادہ تھا.....

ہمیں کچھ آدمی بہتے نظر آئے لیکن ان میں کوئی بھی زندہ نہیں تھا۔ وہ سب لاشیں تھیں جنہیں دریا باہر پھینکتا جا رہا تھا۔ دُور دُور تک کھیتیاں پانی میں ڈوب گئی تھیں اور جو جگہیں گہری تھیں وہاں درخت بھی ڈوب گئے تھے ..... دوسرے دن سیلاب اترنے لگا اور شام تک کنارے ذرا ذرا ننگے ہوئے۔ مرے ہوئے کئی ایک مویشی دیکھے اور ان میں چار چھوٹے چھوٹے بچوں، تین جوان آدمیوں اور ایک بوڑھے کی لاشیں پڑی تھیں۔ معلوم نہیں کہاں کہاں سے بہتے آئے تھے اور ہاتھ پاؤں مارتے کہاں مرے تھے۔ ہم نے ایک جگہ گہرا گڑھا کھودا اور سب کو اس میں دفن کر دیا.....

"دوسرے دن ہماری بستی کے مانجھی بیڑی پتن کا حال دیکھنے نکلے، تو انہیں ایک اور لاش نظر آئی جو کیچڑ میں دبی ہوئی تھی۔ میں بھی ساتھ تھا۔ لاش کا ایک بازو باہر تھا اور سر کے بال بھی نظر آ رہے تھے۔ بازو میں سونے کے دو کڑے تھے۔ ہم نے لاش کو کیچڑ سے نکالا۔ یہ دلہن کی لاش تھی۔ ہاتھوں میں تازہ مہندی تھی۔ دونوں بازوؤں میں سونے کے چار کڑے تھے جو بہت وزنی تھے۔ جھومر تھا، کانوں میں وزنی کانٹے تھے، گلے میں سونے کا ہار تھا۔ اُس زمانے کے ہار آج کی طرح ہلکے پھلکے نہیں ہوتے تھے۔ بہت وزنی بنائے جاتے تھے۔ ان میں سونے کی کئی ایک زنجیریں ہوتی تھیں اور بناوٹ ایسی جیسے بیس پچیس کانٹے زنجیروں میں پرو دیئے گئے ہوں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سات انگوٹھیاں تھیں سونے کی زنجیروں والی نتھ تھی اور ناک سے بھی زیور لٹک رہا تھا جسے بلاک کہا کرتے تھے۔ دونوں ٹخنوں میں پازیبیں تھیں.....

"یہ سارے زیورات پاسہ کے سونے کے تھے۔ اُس زمانے میں زیورات کی خوبصورتی نہیں بلکہ وزن دیکھا جاتا تھا۔ آج کی قیمت کی حساب سے

اُس دُلہن کے جسم پر جو سونا تھا اُس کی قیمت اسّی ہزار نہ ہوئی تو ستر ہزار ضرور ہوگی ۔ ہو سکتا ہے کسی بڑے زمیندار کی اکلوتی بیٹی ہو ۔ اتنا زیور ایک لڑکی کو کون دے سکتا تھا ۔ ہم نے ہر طرف کیچڑ میں دیکھا کہ کوئی اور لاش مل جائے ۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لڑکی ڈولی میں دریا پار کر رہی تھی یا ابھی ڈولی میں بیٹھی نہیں تھی کہ اس کا گاؤں سیلاب کی لپیٹ میں آگیا یا اُس کے سُسرال کا گاؤں دریا کے کنارے ہوگا اور وہ پہلی ہی رات دریا کی بھینٹ چڑھ گئی ۔ ہمیں دُور دُور تک کوئی اور لاش یا جہیز کی کوئی اور چیز نظر نہ آئی ......

"ہم اس لاش کو وہیں دفن نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ اتنے قیمتی زیورات کا مسئلہ تھا ۔ لاش گاؤں میں لے آئے ۔ تین چار دن پانی اور کیچڑ میں رہنے کی وجہ سے لاش سُوج گئی تھی ۔ اسے جلدی دفن کرنا تھا ۔ اگر لاش کی حالت خراب نہ ہوتی تو ہم اُوپر کے علاقے میں آدمی بھیج کر پتہ کرانے کی کوشش کرتے کہ یہ کس کی بیٹی اور بہو ہے ۔ اصل مسئلہ زیورات کا تھا ۔ یہ امانت تھی ۔ گاؤں کی عورتوں نے لاش دیکھی تو اس طرح بین کر کر کے رونے لگیں جیسے یہ ہر کسی کی بیٹی ہو ۔ وہ سولہ سترہ سال کی خوبصورت لڑکی تھی ......

"ہمارے بزرگ سوچنے لگے کہ زیورات کا کیا کیا جائے ۔ دو بزرگوں نے کہا کہ زیورات اتار کر امانت کے طور پر رکھ لیے جائیں اور لاش کو غسل دے کر دفن کر دیا جائے ۔ میرا دادا برادری کا سب سے زیادہ بوڑھا انسان تھا ۔ اُس کے الفاظ مجھے ابھی تک یاد ہیں ۔ اُس نے کہا ___ سونا اور سوانی (عورت) خدا کی دو لعنتیں ہوتی ہیں ۔ ان دو چیزوں نے بھائیوں کے سر بھائیوں کے ہاتھوں کٹوائے ہیں ۔ اتنا زیادہ سونا گاؤں میں رکھنا ٹھیک نہیں ۔ سونے اور سوانی کو دیکھ کر انسان بے ایمان ہوتے ذرا دیر نہیں لگاتا ۔ ہم سب غریب اور گناہگار ہیں ۔ ایسے کرو کہ میّت کو امانت کے طور پر دفن کرو اور زیورات بھی میّت کے ساتھ ہی دفن کر دو ۔ کوئی وارث مل گیا

تو امانت لے جائے گا ۔ نہ ملا تو امانت کی وارث اللہ کی زمین ہوگی ......

"سب نے تجویز مان لی ۔ لڑکی کی میّت کو اس طرح غسل دیا گیا کہ اُس کے کپڑے نہ اتارے گئے ۔ دو بزرگوں کے سامنے دو عورتوں نے میّت پر پانی پھینکا ۔ بالوں میں کنگھی کی اور اس کے کپڑوں اور زیورات پر کھدّر کا کفن لپیٹ کر جنازہ اٹھائے گئے ۔ قبرستان میں جنازہ پڑھا گیا اور دُلہن کو زیورات سمیت دفن کر دیا گیا ......

"معصوم سی دلہن کا افسوس تو ہر کسی کو تھا اور سب سے زیادہ افسوس تو اس کا تھا کہ اُس کے ماں باپ نے بڑے ارمانوں سے اسے دلہن بنایا اور اتنا قیمتی زیور پہنایا تھا مگر اس کی خوشیاں انہیں نصیب نہ ہوئیں ۔ ہو سکتا ہے اس کے ماں باپ بھی سیلاب میں بہہ گئے ہوں ۔ البتہ ہمارے بزرگوں کو یہ اطمینان تھا کہ انہوں نے امانت کو خدا کی زمین کے سپرد کر دیا تھا ۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ دُلہن کے وارثوں کو ڈھونڈا جائے ......

"ہمارے بزرگ بالکل ان پڑھ اور جنگلی تھے لیکن عقل کے کورے نہیں تھے ۔ انہوں نے کہا کہ جب لوگوں کو پتہ چلے گا کہ یہاں اتنے زیادہ قیمتی زیورات پہنے ہوئے ایک دلہن دفن ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ زیورات کے لالچ میں آکر کوئی جھوٹ بول کر لڑکی کی میّت نکال لے جائے ۔ لہٰذا انتظار کیا جائے ۔ شاید کوئی اِدھر آنکلے ، دس پندرہ دن دیکھ لو......

"ہماری بستی کا قبرستان خاصا آباد تھا ۔ اب تو قبروں کا نشان بھی نہیں رہا ۔ اُس وقت بستی میں ۲۶ گھر آباد تھے اور قبرستان میں چالیس پچاس قبریں تھیں ۔ قبرستان کے اندر بھی درخت تھے اور ارد گرد بھی ۔ اس سے کوئی ایک سو گز دُور ہندوؤں کا مرگھٹ تھا جہاں وہ اپنی لاشوں کو جلایا کرتے تھے ۔ مرگھٹ اور قبرستانوں کے متعلق بہت ڈراؤنی باتیں مشہور تھیں ۔ کہتے تھے کہ رات کو وہاں بدروحیں اور چڑیلیں گھومتی پھرتی ہیں ، مگر ہم کئی بار رات کو قبرستان میں سے گزرے ، کلمہ شریف پڑھتے گزر آیا کرتے تھے ۔ ہمیں وہاں

سے اکثر گزرنا پڑتا تھا کیونکہ بیڑی پتن سے شام کے بعد گاؤں آتے یہ راستہ قریب پڑتا تھا۔ بعض آدمی تو آدھی رات کے بعد بھی قبرستان سے گزرا کرتے تھے۔ ہم کبھی ڈرے نہیں تھے۔ اتنا ضرور مانتے تھے کہ وہاں بدرُوحیں اور چڑیلیں ہوتی ہیں......

"دُلہن کو دفن کیے دو دن گذر گئے تھے۔ تیسری رات کا واقعہ ہے کہ ہمارے دو آدمی قبرستان میں سے گذر رہے تھے۔ وہ کلمہ شریف پڑھتے آ رہے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ انہیں اس طرح آواز آئی جس طرح کبوتر اور کبوتری "غٹر غوں، غٹر غوں" کرتے ہیں۔ ان آدمیوں نے اُس طرف دیکھا جدھر سے آوازیں آرہی تھیں۔ انہیں چاندنی میں ایک لاش کھڑی نظر آئی جو سر سے پاؤں تک کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ کبوتروں کی آوازیں سیٹیوں میں بدل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی لاش آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی اور ایک درخت کے تنے کے پیچھے ہو گئی......

"یہ دونوں آدمی بلند آواز سے بسم اللہ شریف اور کلمہ شریف پڑھنے رُک کر اس درخت کو دیکھتے رہے۔ اچانک انہیں اپنے پیچھے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پیچھے دیکھا تو وہی لاش یا ایسی ہی ایک اور لاش سر سے پاؤں تک کفن میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بھی کفن میں ڈھکا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی تو غش کھا کر گر پڑا اور دوسرا بہت تیز دوڑتا گاؤں میں آیا۔ اُس کے گھر والوں نے بتایا کہ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھت کو دیکھتا تھا اور بولتا کچھ بھی نہیں تھا......

"آدھی رات کے وقت دوسرے آدمی کو قبرستان میں ہوش آیا تو وہ گرتا پڑتا اپنے گھر پہنچا۔ اس کی حالت بھی بہت بُری تھی۔ دوسرے دن گاؤں کے لوگ ان کے گھروں میں جمع ہو گئے۔ دونوں کو تیز بخار تھا۔ ہماری برادری میں ایک آدمی کالے علم کا عمل کیا کرتا تھا۔ اس کے قبضے میں جن

تھے۔ ہم سب اسے سائیں اللہ والا کہا کرتے تھے۔ اگلی شام کے وقت ان دونوں آدمیوں نے بتایا کہ انہوں نے رات کو قبرستان میں سے گزرتے کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش دیکھی ہے جو پہلے کبوتروں کی طرح بول رہی تھی پھر سیٹیاں بجانے لگی اور پھر ایک درخت کے پیچھے غائب ہو گئی۔ ذرا دیر بعد وہ ان کے بالکل پیچھے کھڑی ہنس رہی تھی......

"سائیں اللہ والا نے اپنا کوئی عمل کیا اور ان دونوں کو تعویذ دیئے۔ اُس نے کہا کہ میں اپنے جنوں سے کہہ دوں گا کہ ان بدرُوحوں کو قبرستان میں نہ پھرنے دیا کریں۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ اب قبرستان میں سے گذرتے انہیں کوئی چیز تنگ نہیں کرے گی، لیکن ہاتھ میں چھُری، چاقو یا کلہاڑی ضرور ہونی چاہیئے جس کا پھل چمکدار ہو......

"ہم نئے نئے جوان ہوئے تھے۔ جوانی کم بخت اندھی ہوتی ہے۔ میں ایک رات اپنے دو ہم عمر دوستوں کو ساتھ لیے قبرستان میں چلا گیا۔ ہم بھی لاش کو چلتا یا کھڑا دیکھنا چاہتے تھے۔ پہلے واقعہ کو دو راتیں گزر گئی تھیں۔ ان دو راتوں میں گاؤں کا کوئی آدمی ڈر کے مارے قبرستان میں سے نہیں گزرا تھا۔ ہم تین نوجوان قبرستان میں سے گذر رہے تھے۔ تینوں کے پاس چمکتے پھل والی کلہاڑیاں تھیں......

"درمیان میں پہنچے تو ہمیں کسی انسان کی آواز سنائی دی جو نہ ہی مرد کی تھی نہ ہی عورت کی۔ دونوں کے درمیان کی تھی ——— 'میرے دُولہا کی لاش میری قبر میں دفن کرو، نہیں تو تمہارے گاؤں کو تباہ کر دوں گی' ——— یہ آواز ذرا دُور سے آئی تھی اور بہت اداس تھی۔ ہم نے رُک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ بیس پچیس گز دُور ایک تنے کے ساتھ ہمیں کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش نظر آئی۔ چاندنی درختوں کی شاخوں میں سے اس پر پڑ رہی تھی......

"میرے ایک دوست نے کہا ——— 'بھاگو لالو' ——— میں ڈر گیا لیکن میرا دوسرا دوست بہت ہی دلیر تھا۔ اس نے بلند آواز سے لاش

کو کہا ——— "تم پر خدا کی رحمت ہو۔ ہمیں بتاؤ کہ تمہارے دُولہا کی لاش کہاں سے ملے گی۔ اپنا گاؤں بھی بتاؤ۔ تم ہمارے پاس امانت ہو" ——— مَیں اور میرا دُوسرا دوست کلمہ شریف پڑھتے رہے .....

"لاش درخت کے تنے کے پیچھے ہوگئی۔ فوراً ہی ہمارے پیچھے سے آواز آئی ——— "میرے دُولہا کی لاش میری قبر میں دفن کرو، نہیں تو تمہارے گاؤں کو تباہ کر دوں گی" .....

"ہم نے پیچھے دیکھا تو وہی لاش کفن میں لپٹی ہوئی ہمارے پیچھے پندرہ بیس گز دُور کھڑی تھی۔ رات کا وقت اور قبرستان، چاندنی اور اس میں سفید کفن میں کھڑی لاش۔ ہے کوئی دل گردے والا جو کھڑا رہ سکے؟ ہم سرپٹ بھاگے اور گاؤں میں جو پہلا دروازہ کھلا دیکھا وہیں جا گھسے۔ ہم تھے تو ہوش میں لیکن منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ گھر والے پوچھتے تھے کیا ہُوا تو ہم تینوں کی زبانیں بولتے بولتے کانپنے لگتی تھیں .....

"دوسرے دن ہمارے بازوؤں کے ساتھ بھی سائیں اللہ والا کے تعویذ بندھے ہوئے تھے اور ہم بھی لوگوں کو وہی کہانی سُنا رہے تھے جو وہ دو روز پہلے دو آدمیوں سے سُن چکے تھے۔ ہم نے تو قسم کھالی کہ دن کے وقت بھی قبرستان سے نہیں گزریں گے .....

"دو رات بعد گاؤں میں دُور سے چیخیں سنائی دیں۔ پہلے تو یہ گیدڑ کی سمجھی گئیں لیکن غور سے سُنا تو یہ کسی انسان کی چیخیں تھیں۔ گاؤں کے کچھ آدمی چھتوں پر چڑھ گئے۔ مَیں بھی اپنی چھت پر چڑھ گیا۔ سب قبرستان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قبرستان گاؤں سے پچاس گز کے فاصلے سے شروع ہوتا تھا۔ اُس رات بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے چاندنی نہیں تھی۔ ہمیں ایک دیئے کی روشنی نظر آئی جو ایک طرف سے دوسری طرف جاتی تھی اور اُدھر سے پھر واپس چلی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو گز کے فاصلے تک جا کر واپس چلی جاتی تھی۔ روشنی زمین سے اتنی ہی اوپر تھی

جتنی قبر اُونچی ہوتی ہے۔ وہ قبر اس دُلہن کی تھی جسے ہم نے زیورات اور شادی والے جوڑے میں دفن کیا تھا .....

"سائیں اللہ والا بھی چھت پر کھڑا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ہمارے قریب کھڑا کچھ پڑھ رہا تھا اور وہ خوفزدہ تھا۔ چھتوں پر جو لوگ کھڑے تھے، بلند آواز سے کلمہ شریف، درود شریف اور جو کچھ انہیں یاد تھا پڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دیا بُجھ گیا۔ ہر گھر میں یہ پریشانی تھی کہ ان کا کوئی آدمی باہر تو نہیں۔ دو آدمی گھروں میں نہیں تھے۔ ایک کا نام قدرت علی اور دوسرے کا نام دین محمد تھا۔ انہیں ہم قدرُو اور دینو کہا کرتے تھے۔ یہ دونوں اچھے اخلاق کے آدمی نہیں تھے۔ انہیں جوئے کی لت پڑ گئی تھی۔ قدرُو کی شادی ہو چکی تھی۔ دینو کی ابھی منگنی ہوئی تھی۔ اُس رات وہ دونوں گھر سے غیر حاضر تھے۔ راتوں کو تو دونوں غیر حاضر رہتے تھے۔ دوسرے دیہات کے جواریوں سے اُن کا دوستانہ تھا۔ ان کے گھر والے بہت پریشان تھے کہ وہ گھر واپس آتے، قبرستان میں سے گذرے تو بدرُوحیں انہیں مار ڈالیں گی .....

"تھوڑی دیر بعد دونوں دوڑتے ہوئے گاؤں میں آئے۔ وُہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قبرستان میں سے گذر رہے تھے کہ انہیں سیلاب میں سے نکالی ہوئی دُلہن کی قبر پر ایک جلتا ہُوا دیا چلتا نظر آیا۔ انہوں نے رُک کر دیکھا کہ شاید یہ دیا کوئی انسان چلا رہا ہو مگر وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ دیا ہوا میں قبر کے اوپر چل رہا تھا۔ انہیں زنانہ آواز سنائی دی ——— "میرے دُولہا کو میری قبر میں دفن کرو" ——— یہ سُن کر وہ بھاگ آئے .....

"سارے گاؤں نے سائیں اللہ والا کی منّت سماجت کی کہ وہ کوئی ٹونا ٹوٹکا کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ چڑیلیں گاؤں میں آجائیں۔ سائیں اللہ والا دراصل خود بھی ڈرا ہُوا تھا اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے

کہا کہ وہ ایک رات قبرستان میں گزارے گا اور بدرُوحوں کو قابو کرے گا
لیکن اس سے پہلے ایک کالا بکرا ذبح کر کے اس کا سر قبرستان کے درمیان
ایک درخت کے ساتھ لٹکا دیا جائے اور گوشت کی بوٹیاں سارے قبرستان
میں بکھیر دی جائیں.....

"گاؤں والے تین چار گاؤں گھوم کر اگلے ہی دن ایک کالا بکرا لے
آئے۔ سائیں اللہ والے نے دو تعویذ لکھ کر پانی میں ڈالے اور یہ پانی
بکرے کو پلایا، پھر اسے اپنے ہاتھوں ذبح کر کے اس کا سر قبرستان میں
لٹکا دیا اور گوشت کی بوٹیاں سارے قبرستان میں بکھیر دیں.....

"سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے معلوم نہیں کہاں
سے گدھ اور چیلیں آسمان سے تیروں کی طرح ٹوٹ پڑیں اور بوٹیاں اٹھا
لے گئیں۔ سائیں اللہ والا نے گاؤں والوں سے کہا — 'ان گدھوں
میں بدرُوحیں بھی ہیں۔ اب یہ کسی کو تنگ نہیں کریں گی' — ہم گدھوں
کو دیکھ کر بہت ڈرے۔ وہ ایک ایک بوٹی اٹھا کر درختوں یا قبروں پہ بیٹھی
کھا رہی تھیں اور لڑ بھی رہی تھیں۔ ہم سب واپس آ گئے۔ سائیں اللہ والا
نے کہا کہ وہ آج رات قبرستان میں رہے گا اور قبرستان کے ارد گرد لکیر کھینچ
کر بدرُوحوں سے محفوظ کر دے گا.....

"رات آئی تو ہم میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ باہر نکل کر
قبرستان کی طرف دیکھے۔ سارے گاؤں پہ دہشت طاری تھی۔ ہمیں یہ
تسلی تھی کہ سائیں اللہ والا رات کو قبرستان میں اپنا عمل کر کے گاؤں
کو محفوظ کر دے گا.....

"رات گذر گئی۔ صبح کے وقت گاؤں میں شور سنائی دینے لگا۔ میں
باہر نکلا تو لوگ کہہ رہے تھے کہ سائیں اللہ والا قبرستان میں بے ہوش
پڑا ہے اور اس کی پیٹھ سے خون بہہ رہا ہے۔ صبح کے وقت دو ماچھیوں
نے قبرستان سے گزرتے اسے وہاں پڑا دیکھا لیکن وہ بھاگ آئے تھے....

"ہماری برادری میں بڑے بڑے دلیر جوان تھے لیکن کسی میں اتنی جرأت
نہیں تھی کہ جا کر سائیں اللہ والا کو اٹھا لاتا۔ آخر قدرُو اور دینو نے ہمیں للکار
کر کہا — 'ہم سائیں کو اٹھا لائیں گے۔ کوئی مرد کا بچہ ہے تو ہمارے
ساتھ آئے' — دونوں کی ماؤں اور بہنوں نے انہیں روکنے کے لیے
شور مچا دیا لیکن وہ نہ مانے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا اور مجھے دیکھ کر
دو اور آدمی ساتھ چل پڑے۔ ہم ایک چارپائی بھی ساتھ لے گئے.....

"سائیں اللہ والا قبرستان کے قریب درختوں کے نیچے پیٹ کے بل
پڑا تھا۔ اس کی پیٹھ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے کپڑے خون سے
لال ہو گئے تھے۔ اس کے قریب کالے بکرے کا سر پڑا تھا۔ ہم نے
سائیں کی پیٹھ سے قمیض ہٹا کر دیکھی تو پیٹھ پر دو گہرے زخم تھے۔ بکرے کے
سینگ دیکھے تو دونوں کی نوکوں پر خون تھا۔ یہ سر تو سائیں اللہ والا نے
قبرستان کے درمیان ایک درخت سے لٹکایا تھا۔ اس درخت کو دیکھا
تو وہاں رسی لٹک رہی تھی، سر غائب تھا۔ یہ وہی سر تھا جو سائیں اللہ
والا کے پاس پڑا تھا۔ دونوں سینگ سائیں کی کمر میں بہت اندر تک
لگے تھے۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ بکرے کے اسی سر نے سائیں کو ٹکر ماری
ہے۔ یہ سوچ کر ہم ڈر سے کانپنے لگے۔ ہم نے سر کو تو ہاتھ نہ لگایا، سائیں
کو چارپائی پر ڈال کر لے آئے.....

"اس کا خون اتنا نکل گیا تھا کہ چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا۔
اس زمانے میں دُور دُور تک کسی ڈاکٹر یا ہسپتال کا نشان نہیں ملتا تھا۔
جہلم شہر بھی دُور تھا۔ ہم نے کورے سُوت کی اَٹیاں جلا کر اس کے زخموں
میں بھریں اور منہ میں دودھ اور گھی ڈالا۔ پھر فیصلہ کیا کہ اسے جہلم اٹھا لے
جائیں۔ اتنے میں اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی مدھم اور کمزور آواز میں
کہا — 'میں بچ نہیں سکتا۔ مجھے کہیں نہ لے جاؤ' — اس نے زور
لگا لگا کر بتایا کہ آدھی رات کے وقت وہ قبرستان کے ارد گرد حصار کھینچ

کے لیے چل رہا تھا اور اپنا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ درختوں کے قریب پہنچا تو پیچھے سے بکرے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اسے کمر میں بکرے نے ایسی ٹکر ماری کہ اس کے سینگ جسم کے اندر چلے گئے۔ وہ گھوم کر دیکھنے لگا تھا کہ اس کی گردن کسی چیز کے ہاتھ میں آگئی پھر وہ بیہوش ہو گیا.....

"اس نے کہا کہ تم سب کا اللہ مالک ہے۔ اب کوئی آدمی رات کے وقت قبرستان میں سے نہ گزرے۔ یہ کوئی بڑا ظالم شر شرار ہے۔ اسے کوئی بھی قابو نہیں کر سکتا..... یہ کہتے کہتے اس کی نظریں ٹھہر گئیں اور وہ مر گیا۔ گاؤں کے ہر ایک آدمی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سائیں اللہ والا کا جنازہ لے جاتے ہوئے بھی سب ڈرتے تھے لیکن قدرو اور دینو نے سب کا حوصلہ بڑھایا اور ہم سائیں کا جنازہ لے گئے اور اسے بہت جلدی جلدی میں دفن کر کے بھاگ آئے۔ بکرے کے سر کو دیکھا۔ اسے دو گدھ کھا رہے تھے....

"سائیں اللہ والا کی موت سے ہم اس طرح ڈر گئے جیسے کسی بچے کے ماں باپ اکٹھے مر جائیں۔ ہم نے قرآن ختم کرنا شروع کر دیا اور مسجد کے مولوی صاحب چالیس روز کے ایک چلے پر بیٹھ گئے۔ ہم اب دن کے وقت بھی قبرستان میں سے نہیں گزرتے تھے۔ شام کے بعد تو قبرستان کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں تھا۔ شام کے بعد گاؤں کو واپس آنے والے قبرستان سے بہت دور کا چکر کاٹ کر آتے تھے۔ راستے میں ہندوؤں کا مرگھٹ آتا تھا....

"ایک رات شام کے ذرا ہی بعد ہمارے تین آدمی مرگھٹ کے قریب سے گزرے تو انہیں وہاں کفن میں لپٹی ہوئی لاش کھڑی نظر آئی۔ ہمارے آدمی بھاگ آئے اور اس کے بعد لوگوں نے اس راستے سے بھی گزرنا چھوڑ دیا.....

"یہاں سے ہمیں یہ شک ہونے لگا کہ جس دلہن کو ہم نے مسلمان سمجھ کر دفن کر دیا ہے وہ کہیں ہندو تو نہیں تھی؟ اتنا زیادہ سونا صرف ہندو ہی اپنی لڑکی کو دے سکتے تھے۔ بڑی دولت مند قوم تھی۔ ہم نے سوچا کہ

لڑکی کی لاش قبر سے نکال کر مرگھٹ میں لے جائیں اور جلا دیں لیکن مولوی صاحب نے روک دیا۔ کہنے لگے کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لاش کے ماتھے پر تلک نہیں تھا۔ ان کے کہنے سے ہم نے یہ ارادہ چھوڑ دیا.....

"تھوڑے دنوں بعد راتیں اندھیری ہو گئیں۔ چاند ختم ہو گیا تھا۔ اب تو ہمارے مانجھی سورج غروب ہوتے ہی گھروں کو آجاتے تھے۔ کتنا ہی ضروری کام ہو تو بھی قبرستان یا مرگھٹ کے قریب سے نہیں گزرتے تھے.... معلوم نہیں ہماری غریب سی بستی پر خدا کیوں اتنا ناراض ہو گیا تھا.....

"ایک نئی مصیبت آگئی۔ ایک روز ہمارے گاؤں کے چھ سات آدمی سورج غروب ہونے سے بہت پہلے گاؤں میں آئے۔ ایک نے چادر میں کچھ باندھ رکھا تھا۔ چادر پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ اس آدمی نے گاؤں میں آکر باہر ہی یہ گٹھڑی رکھ دی۔ جب گٹھڑی کھلی تو کہرام مچ گیا۔ یہ ہماری برادری کے ایک جوان آدمی کی لاش تھی لیکن لاش سالم نہیں تھی۔ سر، کندھے اور ایک بازو تھا، دو تین پسلیاں تھیں اور ایک آدھی ٹانگ الگ تھی۔ کچھ انتڑیاں بھی تھیں.....

"لاش کے یہ حصے اُس جگہ سے ملے تھے جہاں میں نے تمہیں پہلی کہانی میں سنایا تھا کہ دریا کنارا کاٹ کر باہر آجاتا ہے۔ ادھر اُدھر چٹانیں ہیں اور ان کے درمیان دلدل ہے۔ یہیں سے میں نے اُس آدمی اور لڑکی کو اپنی کشتی میں بٹھایا تھا.....

"ہم بہت سے آدمی وہاں گئے تو دلدل پر مگرمچھ کے پنجوں اور اُس کی دُم کے صاف نشان دیکھے۔ اس سے پہلے ہم نے دریا میں صرف ایک بار مگرمچھ دیکھا تھا جو دو روز ایک جگہ رہ کر غائب ہو گیا تھا۔ اُس وقت میں چھوٹا تھا۔ مگرمچھوں کے متعلق ہم نے بہت ہی خوفناک کہانیاں سُنی ہوئی تھیں۔ لیکن میری برادری کے بزرگوں نے کہا کہ یہ مگرمچھ نہیں۔ اُسی دلہن کی بدروح ہے جسے ہم نے زیورات سمیت دفن کیا ہے۔ انہوں نے

یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ یہ مگر مچھ ہی ہے اور سیلاب میں کہیں دُور اُوپر سے یہاں تک آگیا ہے لیکن زیادہ تر لوگوں نے پورے یقین سے کہہ دیا تھا کہ اگر ذبح کئے ہوئے بکرے کا صرف سر بدرُوح بن کر ایک آدمی کو جان سے مار سکتا ہے تو بدرُوح مگر مچھ بھی بن سکتی ہے ......

"مانجھیوں نے نذر نیاز دی اور سوچنے لگے کہ کسی پہنچ والے پیر فقیر کو بلایا جائے لیکن یہ فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ کِسے بُلایا جائے۔ جلال پُور شریف کی بھی بہت کرامات سُنی تھیں۔ کسی نے کہا کہ میرپُور میں ایک بزرگ ہیں جن کے قبضے میں جنّ اور بدرُوحیں ہیں۔ اس طرح کئی ایک پیر اور عامل تجویز ہُوئے ......

"تیسرے دن اُسی جگہ ایک دُودھ والی گائے دریا سے پانی پی رہی تھی۔ دو لڑکے ذرا دُور بیٹھے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دریا سے مگر مچھ کا منہ باہر نکلا اور فوراً ہی گائے کا مُنہ مگر مچھ کے مُنہ میں جکڑا گیا۔ گائے بہت تڑپی۔ اس نے اتنا زور لگایا کہ مگر مچھ کو دریا سے باہر گھسیٹ لائی لیکن اس کا پورے کا پورا منہ گردن تک مگر مچھ نے اتنے بڑے بڑے دانتوں میں جکڑا ہوا تھا۔ آخر گائے گر پڑی۔ مگر مچھ نے اسے پنجوں سے بھی پکڑ لیا اور پانی میں غائب ہو گیا ......

"دُوسرے دن اس جگہ سے ایک میل دُور ایک کشتی دریا میں اُلٹ گئی۔ اس میں چھ آدمی تھے۔ کشتی میں دو مانجھی تھے۔ انہوں نے پانچ آدمیوں کو بچا لیا مگر چھٹا غائب ہو گیا۔ مانجھیوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک مگر مچھ کا منہ دیکھا تھا۔ کشتی اسی نے اُلٹائی تھی اور جو مسافر غائب تھا وہ اسی کے پیٹ میں چلا گیا ......

"یہ مانجھی جہلم کے تھے۔ انہوں نے اپنے پتن پر جا کر یہ حادثہ سُنایا تو خبر ڈپٹی کمشنر تک پہنچ گئی۔ وہ انگریز تھا۔ ایک دو دنوں بعد وہ دو انگریزوں کو ساتھ لیے ایک کشتی میں آگیا۔ سب کے پاس بندوقیں تھیں۔ کشتی

میں وہی دو مانجھی تھے جن کی کشتی اُلٹی تھی ......

"وہ ہمارے پتن پر آئے تو ہم نے انہیں بتایا کہ مگر مچھ ایک آدمی اور ایک گائے کو کھا چکا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے اُس جگہ ایک بکرا بندھوا دیا اور تینوں انگریز چھُپ کر بیٹھ گئے۔ دو تین گھنٹے بعد مگر مچھ نے دریا سے سر نکالا اور بکرے کی طرف آیا۔ ایک انگریز نے گولی چلا دی۔ مگر مچھ فوراً غائب ہو گیا۔ اس انگریز نے بہت جلدی گولی چلا دی تھی۔ شام کے وقت ڈپٹی کمشنر اپنی پارٹی سمیت جہلم چلا گیا۔ وہ ہمیں تسلّی دے گیا تھا کہ وہ مگر مچھ کو مار کر دم لے گا لیکن چار دنوں بعد آئے گا کیونکہ وہ کہیں باہر جا رہا تھا ......

"ان چار دنوں کے اندر کچھ اور ہی واقعہ ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے جانے کے اگلے روز تین آدمی ہمارے گاؤں میں آئے۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ لباس سے امیر کبیر زمیندار لگتے تھے۔ دو کے پاس پستول اور ایک کے کندھے کے ساتھ بندوق لٹک رہی تھی۔ وہ ہمارے گاؤں میں گھوڑوں سے اُترے اور گاؤں کے بزرگ اُن سے ملے ......

"انہوں نے کہا۔ "تم لوگ مانجھی ہو۔ جب سیلاب اُتر جاتا ہے تو کئی لاشیں کناروں سے باہر رہ جاتی ہیں۔ یہ جو سیلاب آیا تھا اس میں سے تم لوگوں نے کوئی لاش نکالی تھی"؟ ......

"یہ تو ہر سیلاب کے بعد ہوتا تھا کہ اِدھر کے دیہات کے لوگ لاشوں کی تلاش میں دُور دُور تک دریا کے کنارے چلے جایا کرتے تھے۔ ان تین آدمیوں کو بتایا گیا کہ کچھ لاشیں ایک ہی گڑھے میں دفن کر دی تھیں اور ایک لڑکی کی لاش قبرستان میں دفن کی تھی، وہ دُلہن تھی ......

"اتنا سنتے ہی ایک آدمی نے پوچھا ___ "اُس نے بہت سارا زیور پہن رکھا تھا؟" ___ پھر اُس نے دُلہن کے کپڑوں کے متعلق پوچھا۔ ہمارے بزرگوں نے ان سے پوچھا کہ زیورات کیا تھے۔ ان آدمیوں نے تمام

زیورات بالکل صحیح بتا دیئے اور ایک آدمی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ یہ لڑکی کا باپ تھا۔ ایک لڑکی کا ماموں اور تیسرا لڑکی کا سُسر تھا۔ وہ لوگ پچیس میل اوپر کے رہنے والے تھے۔ لڑکی کی ڈولی ابھی دریا کے ایک کنارے سے دوسرے پر اُتری تھی کہ سیلاب آ گیا۔ کہاروں نے ڈولی گھبرا کر اٹھائی تو ڈولی اُلٹ گئی اور لڑکی دریا میں جا پڑی۔ سیلاب بہت تیزی سے چڑھ آیا، پھر رات ہو گئی اور ہر کوئی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ اُٹھا۔۔۔

"سیلاب اترنے کے بعد یہ لوگ دریا کے کنارے کے ہر گاؤں میں گئے اور جب ہمارے گاؤں میں آئے تو مایوس ہو چکے تھے۔ کہتے تھے کہ یہاں سے بھی کوئی سراغ نہ ملا تو واپس چلے جائیں گے۔۔۔۔۔

"انہیں معلوم تھا کہ لاش کی حالت اب تک بہت خراب ہو چکی ہوگی۔ وہ جہلم گئے اور دوسرے دن لکڑی کا ایک تابوت بنوا لائے۔ ہم نے انہیں بتا دیا تھا کہ لڑکی کو زیورات اور کپڑوں سمیت امانت کے طور پر دفن کیا گیا تھا۔ ہم بہت سے آدمی ان کے ساتھ قبرستان میں گئے۔ ہم بہت خوش تھے کہ لڑکی کی لاش یہاں سے چلی جائے گی تو ہمیں بد رُوح سے نجات مل جائے گی۔۔۔۔۔

"قبر کھودی، لاش سامنے آئی تو اس کی حالت بہت بُری تھی۔ یہ پانی سے نکلی ہوئی لاش تھی جس کی حالت دفن ہونے سے پہلے ہی بگڑی ہوئی تھی۔ چہرہ پہچانا تو جاتا تھا لیکن سُوج گیا تھا۔ باقی جسم کا بھی یہی حال تھا۔۔۔

"مگر یہ دیکھ کر ہم سخت ڈرے کہ لاش سے کفن ہٹا ہوا تھا جیسے کسی نے لاش کو ننگا کیا ہو۔ ہم نے لاش کو اچھی طرح کفن میں لپیٹ کر دفن کیا تھا پھر یہ کفن ہٹایا کس نے ہے؟ میں نے سوچا کہ رات کو قبرستان میں جو لاش کفن میں کھڑی نظر آتی تھی، اُسی لڑکی کی تھی اور اس کی بد رُوح نے اس کا کفن ہٹایا ہے۔۔۔۔۔

"ہم نے لاش باہر نکالی اور تابوت میں رکھ دی۔ لڑکی کے باپ نے ہم سب کو مخاطب کر کے کہا ——— "تم سب نے کہا تھا کہ لڑکی کو زیورات سمیت دفن کیا تھا۔ آگے ہو کر دیکھو اور ہمیں بتاؤ کہ زیورات کہاں ہیں۔۔۔ سب نے دیکھا۔ میں نے بھی آگے ہو کر دیکھا۔ زیورات کی ایک بھی چیز لاش کے ساتھ نہیں تھی۔ سب خاموش ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے قبر میں اُتر کر دیکھا، کفن ہٹا کر دیکھا، زیورات غائب تھے۔۔۔۔۔

"ہم سب غریب مانجھی تھے جن کی ان تین زمینداروں اور جاگیرداروں کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ خدا گواہ ہے کہ خدا کو ہی حاضر ناظر جان کر ہم نے لڑکی کو زیورات سمیت امانت کے طور پر دفن کیا تھا مگر ہم غریب تھے اس لیے ہمیں ان جاگیرداروں نے چور سمجھا۔ وہ کیسے یقین کر سکتے تھے کہ ہم نے اتنا قیمتی زیور دفن کر دیا ہوگا۔۔۔۔۔

"انہوں نے ہمیں خبردار کیا اور دھمکی دی کہ تمام زیور ہمارے حوالے کر دو ورنہ گاؤں کے بچے بچے کو ہتھکڑیاں لگوا کر جہلم کے جیل خانے میں بند کرا دیں گے۔ ہمارے بزرگوں نے خدا، رسول صلعم اور قرآن کی قسمیں کھائیں، پھر انہیں یہ بھی سنایا کہ رات کو کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش قبرستان میں کھڑی دیکھی جاتی رہی ہے۔ انہیں بد رُوح کی ساری باتیں سنائیں اور سائیں اللہ والا کی موت کا واقعہ بھی سنایا پھر ہمارے مولوی صاحب نے انہیں کہا کہ چلو مسجد میں، میں قرآن پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤں گا کہ زیورات میرے سامنے لاش کے ساتھ دفن کیے گئے تھے۔۔۔۔۔

"ان تین آدمیوں نے ہماری کسی قسم پر یقین نہ کیا۔ انہوں نے کہا ——— "ہم اپنی بچی کی میّت کو زیادہ دیر باہر نہیں رکھ سکتے۔ ہم میّت لے جا رہے ہیں، کفن دفن کے بعد آئیں گے۔ کل آئیں، پرسوں آئیں یا چھ دن بعد آئیں۔ جب بھی آئیں تمام زیورات چُپ کر کے ہمارے حوالے کر دینا، نہیں تو یہ گاؤں خالی کر جانا۔ ہم گاؤں کو آگ لگا دیں گے یا تمہاری عورتوں کو اٹھا لے جائیں گے یا گاؤں کے بچوں اور عورتوں کو بھی جیل خانے میں

بند کرا دیں گے......

"وہ تابوت ایک گھوڑے پر رکھ کر لے گئے۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ بزرگوں کی عقل جواب دے گئی۔ ہم جو پندرہ سولہ جوان تھے، بزرگوں سے کہا کہ ہم یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں آنے دو۔ ان میں سے کسی کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ بزرگوں نے ہمیں سمجھایا بجھایا کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ ہم جاگیرداروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ معلوم نہیں خدا ہمیں کون سے گناہ کی سزا دے رہا ہے۔ کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ کسی نے قبر کھود کر زیورات چرا لیے ہوں......

"ہمارے مولوی صاحب نے گاؤں والوں سے کہا کہ ہر ایک آدمی مسجد میں آ کر اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے کہ اُسے زیورات کا کوئی علم نہیں۔ اُسی شام کی نماز کے بعد گاؤں کے ہر ایک مرد نے نہا کر نماز پڑھی اور سب نے باری باری مولوی صاحب کے ہاتھ پر رکھے ہوئے قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہا ——— 'اگر مجھے زیورات کا کچھ علم ہو تو مجھے خدا کا پاک کلام اسی دنیا میں سزا دے'......

"مولوی صاحب نے پوچھا کہ گاؤں کا کوئی آدمی رہ تو نہیں گیا؟ ——— ایک آدمی نے کہا ——— 'قدرو اور دینو نہیں ہیں' ——— ان کے گھر آدمی بھیجا۔ پتہ چلا کہ وہ بہت دیر سے اکٹھے ہی باہر گئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، وہ جواری اور آوارہ تھے، اپنے دھندے پر کہیں نکل گئے ہوں گے۔ وہ ساری رات غائب رہے۔ دوسرے دن بھی نہ آئے اور اگلی رات دینو آ گیا مگر قدرو اس کے ساتھ نہیں تھا......

"دینو بہت گھبرایا ہوا تھا۔ قدرو کے متعلق پوچھا تو اس نے گول مول سا جواب دیا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی خاص بات ہو گئی ہے لیکن اس نے کچھ نہ بتایا۔ اس سے اگلے روز اچانک دو انگریز آ گئے۔ یہ وہی تھے جو ڈپٹی کمشنر کے ساتھ مگرمچھ کو مارنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس کا

ایک افسر بھی تھا۔ وہ مسلمان تھا اور ساتھ دو اردلی تھے۔ ان کے پاس بندوقیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ جہاں مگرمچھ نے ایک گائے اور آدمی کو مارا تھا وہاں بکرا یا بچھڑا باندھیں......

"ہم ایک بچھڑا کھول کر ان کے ساتھ چلنے ہی لگے تھے کہ تینوں گھوڑ سوار آ گئے۔ ان کے ساتھ دس بارہ آدمی پیدل آئے تھے۔ سب کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ پولیس افسر نے اُن سے پوچھا کہ وہ کس کام سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ دُلہن کے باپ نے انہیں سارا واقعہ سُنایا اور ہم پر الزام لگایا کہ ہم نے اُن کی لڑکی کی لاش سے زیورات اُتار لیے ہیں۔ پولیس افسر نے انہیں کہا کہ وہ تھانے میں باقاعدہ رپورٹ درج کرائیں۔ اگر انہوں نے گاؤں میں کوئی دنگا فساد کیا تو سب کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس نے انہیں کہا کہ ہمارے ساتھ دو انگریز فوجی افسر آئے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی گڑبڑ نہ کریں۔ گاؤں میں ہی ٹھہریں یا جہلم چلے جائیں۔ بہرحال وہ سب گاؤں کے باہر بیٹھ گئے اور ہم چند ایک آدمی انگریز افسروں کے ساتھ مگرمچھ کا شکار دیکھنے چلے گئے......

"اُس جگہ جا کر بچھڑا باندھ دیا اور سب چھپ کر بیٹھ گئے۔ ایک انگریز ایک طرف کنارے پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور دوسرا اس کے بالمقابل اسی کی طرح لیٹ گیا۔ انہوں نے بندوقیں آگے کر لی تھیں۔ مشکل سے آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ پانی میں مگرمچھ کا لمبوترا مُنہ نظر آیا۔ وہ بہت تیز بچھڑے کی طرف آ رہا تھا۔ بچھڑے کی رسّی لمبی تھی۔ مگرمچھ کو دیکھ کر وہ بھاگنے لگا لیکن رسّی نے اُسے روک لیا۔ رسّی لمبی ہونے کی وجہ سے وہ پانی سے دُور جا رُکا۔ مگرمچھ پانی سے باہر آ گیا۔ دیکھ کر ہمارے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بہت ہی بڑا تھا۔ جونہی پانی سے باہر آیا، دونوں انگریزوں نے گولیاں چلا دیں۔ بعد میں دیکھا کہ گولیاں اس کی آنکھوں میں لگی تھیں......

"مگر مچھ تڑپ کر اُلٹا ہو گیا۔ پولیس افسر نے اس کے پیٹ میں پستول کی گولی چلائی اور دونوں انگریزوں نے بھی گولیاں چلائیں۔ وہ اندھا ہو گیا تھا اور پانی میں واپس جانے کی بجائے خشکی کی طرف بھاگنے لگا۔ کبھی ایک ہی جگہ گھومنے لگتا تھا۔ انگریزوں اور پولیس افسر نے اب قریب آکر اس کے پہلوؤں میں اور پیٹ میں گولیاں مارنی شروع کر دیں۔ ایک بار اُس کا مُنہ پورا کھل گیا۔ ایک انگریز نے اس کے مُنہ میں گولی ماری۔ وہ بہت دیر ایک ہی جگہ ہلتا جلتا رہا۔ اُس کے پیٹ اور آنکھوں سے خون فواروں کی طرح نکل رہا تھا۔ آخر وہ بالکل بے حس ہو گیا.....

"ہم تو اس کے قریب جاتے ڈرتے تھے لیکن انگریزوں کے حکم سے ہم بہت سے آدمیوں نے اُسے اُلٹا کر دیا۔ اس کے پیٹ میں تین چار سُوراخ تھے۔ ایک انگریز نے اپنے تھیلے سے بہت بڑا چاقو نکالا اور ایک مانجھی کو دے کر کہا کہ مگر مچھ کا پیٹ چاک کر دو۔ اس کے اندر سے بہت کچھ نکلے گا۔ دوسرے انگریز نے بھی اتنا ہی بڑا چاقو نکال کر ایک اور مانجھی کو دیا.......

"دونوں مانجھیوں نے مگر مچھ کا پیٹ پھاڑ دیا۔ اس کے اندر سے پہلے تو گائے کے سینگ اور کھوپڑی نکلی، پھر ایک انسانی ٹانگ برآمد ہوئی۔ کچھ کپڑے بھی نکلے اور پھر ایک انسانی دھڑ نکلا جو آدھا تھا۔ سر، کندھے، دونوں بازو، سینہ اور کولہوں تک دھڑ بالکل صحیح تھا۔ ٹانگیں بالکل الگ تھیں.....

"ہم نے جب بغیر ٹانگوں کے اس دھڑ کو الگ رکھا تو ہمارے ایک مانجھی نے سخت گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ــــــ "یہ قدرو کی لاش ہے"۔ ہم سب نے چہرہ دیکھا وہ واقعی قدرو تھا۔ اس کی کمر کے گرد ایک کپڑا بندھا ہوا تھا جس میں سے کوئی چمکتی ہوئی چیز باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے کپڑا کھولا تو اس میں سے وہ سارے زیورات برآمد ہوئے جو دُلہن

کی لاش کے ساتھ تھے۔ جن آدمیوں نے دُلہن کی لاش دیکھی تھی انہوں نے ہر ایک چیز پہچان لی۔ پولیس افسر نے زیورات اپنے قبضے میں لے لیے...

"پولیس افسر کو لڑکی کے وارث بتا چکے تھے کہ ان کی لڑکی کی لاش سے زیورات چوری کئے گئے ہیں۔ اس نے انگریز افسروں کو بھی یہ واردات سنائی۔ ہم سب گاؤں میں آئے تو انگریز بھی زیورات کی چوری میں دلچسپی لینے لگے۔ لڑکی کے وارثوں کو زیورات دکھائے گئے تو انہوں نے فوراً پہچان لیے۔ پولیس افسر نے ہم سب کو گرفتاری کی دھمکی دے کر کہا کہ زیورات کے چور کو مگر مچھ سزائے موت دے چکا ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو علم ہے کہ اس نے زیورات لاش سے کس طرح اتارے تھے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو سب کو ہم بہت پریشان کریں گے.....

"گاؤں والوں نے اُسے بتایا کہ قدرو اور دینو اکٹھے غائب ہو گئے تھے۔ دینو کو شاید کچھ معلوم ہو۔ پولیس افسر نے دینو کو بُلا کر پوچھا تو اُس نے بالکل ہی لاعلمی ظاہر کی۔ انگریز اُردو بولتے تھے۔ وہ ساری کہانی سُن چکے تھے۔ انہوں نے دینو کو ایک درخت کے ساتھ کھڑا کر دیا اور کہا کہ اُس نے ساری بات نہ بتائی تو اُسے وہیں گولی مار دیں گے۔ انگریز بادشاہ تھے۔ ہم سب انگریز کے سائے کو بھی سلام کرتے تھے۔ جب دونوں انگریزوں نے دینو کی طرف بندوقیں سیدھی کیں تو وہ دہائی دہائی کرنے لگا اور اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــــ "صاحب بہادر! ابھی بتاتا ہوں، بندوقیں نیچے کر لو"....

"دینو کو زمین پر بٹھا دیا گیا اور اُس نے جو اقبالِ جرم کیا وہ یہ تھا کہ جس روز دُلہن کو زیورات سمیت دفن کیا گیا تھا، اُسی روز قدرو اور دینو نے زیورات کی چوری کا ارادہ کر لیا تھا لیکن قبر کھودنے کے لیے اور زیورات اتارنے اور قبر میں مٹی ڈالنے کے لیے بہت سارا وقت درکار تھا۔ رات کے وقت اکثر گاؤں کے آدمی قبرستان میں سے گزرتے تھے۔ ان دونوں نے سینہ

چادریں لیں اور رات کے وقت کفن کی طرح چادریں اپنے جسم پر لپیٹ لیتے تھے۔ قدرو ذرا دُور چھپا رہتا تھا اور دینو قبرستان میں سے گزرنے والے راستے کے قریب ایک پختہ قبر کے پیچھے چھُپ کر بیٹھ جاتا۔ جب کوئی آدمی قبرستان میں سے گزرتا تھا تو قدرو دُور سے آوازیں نکالتا تھا۔ وہ بولتے بولتے پیچھے ہٹتا کسی درخت کے تنے کے پیچھے غائب ہو جاتا تھا، پھر دینو جو اس آدمی کے بالکل پیچھے قبر کے پیچھے چھپا ہوتا تھا اُٹھ کر قدرو کی طرح بولتا تھا۔ اس آدمی کو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کفن میں لپٹی ہوئی جو لاش درخت کے پیچھے غائب ہو گئی تھی، اب اس کے پیچھے آ ظاہر ہوئی ہے......

"ان دونوں کا مقصد یہ تھا کہ گاؤں کے لوگ قبرستان میں سے گزرنا چھوڑ دیں تاکہ وہ رات کے وقت قبر کھود کر زیورات نکال سکیں۔ ان دونوں کا رات کے وقت گھروں سے غیر حاضر رہنا کسی کے لیے عجوبہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اکثر غیر حاضر رہتے تھے۔ وہ دونوں جواری، چرسی اور بدمعاش تھے۔ انہوں نے کفن میں لپٹی ہوئی لاشوں کا ڈرامہ تھوڑے دن کھیلا، پھر ایک رات قبر پر جلتا ہوا دیا چلاتے رہے۔ دُور سے وہ خود تو نظر نہیں آتے تھے۔ دیئے کی لَو دکھائی دیتی تھی جو قبر کے اوپر اُوپر چلتی تھی......

"سائیں اللہ والا کو انہوں نے اس طرح مارا تھا کہ سائیں نے بکرے کا جو سر قبرستان میں درخت سے لٹکایا تھا اس کے سینگ اتفاق سے خنجروں کی طرح نوکیلے اور سیدھے تھے۔ رات کو انہوں نے بکرے کا سر درخت سے اتار لیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ سائیں اللہ والا رات کو قبرستان کے اردگرد حصار کھینچے گا.....

"سائیں جب قبرستان کے کنارے کے درختوں کے قریب پہنچا تو پیچھے سے قدرو نے جو ایک درخت کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا،

بکرے کے سر کو مضبوطی سے پکڑ کر سینگ اس کی کمر میں اتنی زور سے مارے کہ دونو سینگ اس کے جسم میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے قدرو بکرے کی طرح بولا تھا۔ سائیں پیچھے مڑنے لگا تو قدرو نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچ لی اور سائیں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر وہ دونوں بھاگتے ہوئے گاؤں میں آئے اور بتایا کہ آج رات انہوں نے بھی کفن میں لپٹی ہوئی لاش دیکھی ہے.....

"یہ آوازیں قدرو اور دینو کی ہوتی تھیں کہ میرے خاوند کو میری قبر میں دفن کرو، نہیں تو تمہارے گاؤں کو تباہ کر دوں گی.....

"آخر ان کی سکیم کامیاب ہو گئی۔ ایک رات دونوں نے قبر کھودی اور لاش سے زیورات اتار کر قبر کو پھر بھر دیا۔ قبرستان میں تو کوئی جاتا ہی نہیں تھا، اس لیے انہیں یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی قبر کو دیکھ کر اس قسم کا شک کرے گا۔ انہوں نے زیورات ایک جگہ چھپا دیئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ میرپور یا گجرات جا کر بیچیں گے.....

"جس روز لڑکی کے وارث اس کی تلاش میں آئے اور انہوں نے لاش نکالی تو انہوں نے بڑی سخت دھمکی دی۔ قدرو اور دینو کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر پولیس آ گئی تو زیورات برآمد نہ ہو جائیں۔ وہ زیورات نکال کر گاؤں سے نکل گئے۔ رات بھر وہ دریا کے کنارے بیٹھے سوچتے رہے کہ انہیں کہاں لے کر بیچیں۔ رات وہیں گزار دی۔ زیورات قدرو نے اپنی لمرکے کے دوپٹے میں باندھ رکھے تھے.....

"دوسرے دن سورج نکلا تو دینو کی آنکھ کھلی۔ قدرو دریا کے کنارے ایک درخت تلے ابھی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ دینو اُٹھ کر پیشاب کرنے پرے چلا گیا۔ واپس آ رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ مگرمچھ تیزی سے دریا سے نکلا اور سوئے ہوئے قدرو کو منہ میں پکڑ لیا۔ اُس نے منہ اوپر کیا اور ایک دو جھٹکے دیئے تو قدرو اس کے منہ میں غائب ہو گیا۔ زیورات بھی اس

کے ساتھ ہی چلے گئے ۔ دینو خوف زدہ حالت میں گاؤں میں واپس آگیا اور کسی کو نہ بتایا کہ قدرو کہاں غائب ہو گیا ہے.....

"آخر زیورات برآمد ہو گئے ۔ یہ خدا کے نام پر ایک امانت زمین کے حوالے کی تھی اور یہ ایک نو عمر دلہن کی امانت تھی جو خدا نے وارثوں کو دلا دی ۔ چونکہ اس واردات میں ایک آدمی (سائیں اللہ والا) قتل ہو گیا تھا، اس لیے پولیس افسر دو انگریزوں کی موجودگی میں دینو کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ زیورات لڑکی کے وارثوں کو دے دیئے گئے اور دینو کو پولیس افسر ساتھ لے گیا ۔ مرے ہوئے مگرمچھ کو بھی وہ کشتی میں ڈال کر لے گئے ۔ دینو کے باپ نے اس کا مقدمہ نہیں لڑا نہ اس میں اتنی ہمت تھی ۔ اس روز کے بعد دینو واپس نہیں آیا ۔ کوئی کہتا تھا کہ اسے دو سال سزا ہوئی ہے اور کوئی کہتا تھا اسے عمر قید کالا پانی کی سزا ملی ہے اور کوئی کہتا تھا کہ اسے پھانسی دے دی گئی ہے ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی کہیں چلا گیا ہو۔ اگر اس کے خلاف مقدمہ چلتا تو گاؤں والوں کو گواہی کے لیے ضرور بلاتے ۔ کسی کو بھی نہ بلایا گیا —— اس کے بعد گاؤں والوں کو نہ کبھی بدروح نظر آئی نہ دینو۔"